آدمی آبادی کے جذبات واحساسات کا ترجمان

ماہنامہ

خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

اگست 2020

www.urducouncil.nic.in

قیمت : -/10₹

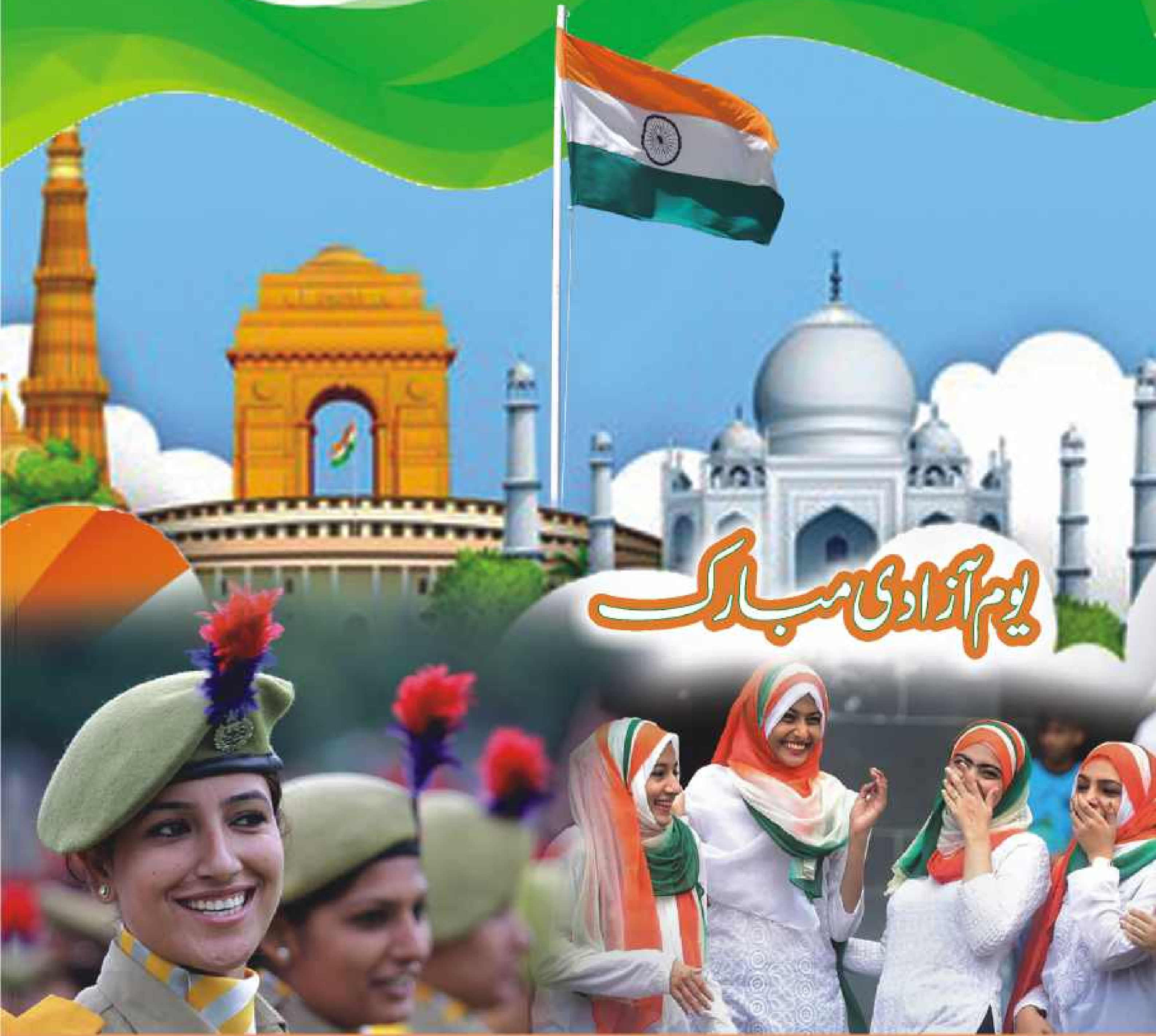

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ بچوں کی دنیا دہلی

Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں

قسط وار ناول

دل چسپ کہانیاں

معلوماتی مضامین

ہنسنے ہنسانے کی باتیں

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ سیاحتی مقامات

اردو فیس بک ◆ دماغی ورزش

ننھے فنکار ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

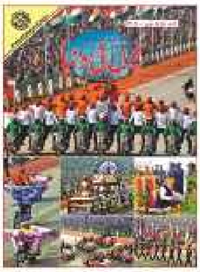
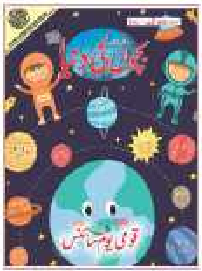

سب سے زیادہ چھپنے والا بچّوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے   سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

اداریہ	مشعل	مدیر	4
شخصیت	دھنک رنگ شاعری کی خالق: پروین شاکر	ڈاکٹر سفینہ	5
نکہت سخن	شاعرات کے منتخب اشعار		9
تحریک آزادی	تحریک آزادی میں مسلم خواتین کا کردار	شاہ جہاں بیگم	10
	انقلاب 1857 اور بیگم حضرت محل	سیدہ کفیل فاطمہ	15
جہان نسواں	میرا کانت کے ڈراموں کا تجزیاتی مطالعہ	ڈاکٹر عبدالحفیظ	21
	کشور جہاں زیدی کی علمی و ادبی سرگرمیاں	محمد اویس سنبھلی	24
	پریم چند کے افسانوں کا تجزیہ	ڈاکٹر یاسمین خاتون	28
	ہندوستان کی اہم خواتین طنز و مزاح نگار	بلال احمد ڈار	32
	سوشل میڈیا اور نصف آبادی کے مسائل	محمد علم اللہ	37
کہانیاں	بوڑھی کاکی	ڈاکٹر شہناز یوسف	41
	کم ظرف	صاحبہ فردوس	45
حسن سخن	ڈاکٹر مشتاق احمد، میمونہ علی چوگلے		49
باورچی خانہ	لذیذ پکوان		51
صحت	حالات کے اعتبار سے غذا اور خوراک	شکیل احمد	53
آرائش وزیبائش	صنف نازک کا فطری اثاثہ 'حسن'	نثار حسن	57
تاثرات	تاثرات نگر نگر سے		59
خواتین خبرنامہ			61

آدھی آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان

ماہنامہ خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly, New Delhi

جلد: 4 شمارہ: 8 اگست 2020

مدیر اعلیٰ : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

مدیر منتظم : ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی

مشیر : ڈاکٹر مسرت

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا

فیز-II، نئی دہلی- 110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت -/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

صفحات: Total Pages 64

- قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL، New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا

جسولہ، نئی دہلی-110025، فون: 49539000

نگارشات ارسال کرنے کے لیے

ای میل: kduniya@ncpul.in

editor@ncpul.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر کے پورم، نئی دہلی- 110066

فون: 26109746، فیکس: 26108159

ای میل: sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com

شاخ: 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002

فون: 24415194 - 040

مشعل

عالمی وبا 'کورونا' کی وجہ سے جہاں بہت سے راستے مسدود ہوئے ہیں وہیں بہت سے نئے دریچے بھی کھلے ہیں۔ اس عالمی وبا کی وجہ سے لوگوں کو کچھ نئے تجربے کرنے کے مواقع میسر آئے خاص طور پر آن لائن تعلیم وتدریس کا ایک نیا تجربہ ہوا جس سے وہ لوگ بھی فیضیاب ہوئے جو اس سے قطعی لاعلم تھے۔ اس سے تعلیم وتدریس کو ایک نئی راہ اور ایک نئی سمت ملی اور یہ احساس ہوا کہ اگر راہیں مسدود ہو جائیں تو نئے راستے بھی کھولے جاسکتے ہیں۔ زندگی کبھی ٹھہرتی نہیں ہر حال میں جاری وساری رہتی ہے اور کائنات کا ہر عمل موانع اور مشکلات کے باوجود ایک تسلسل میں رہتا ہے۔ زندگی کا تحرک ختم نہیں ہوتا کورونا نے ہمیں یہی سبق دیا کہ لاکھ مشکلات ہوں مگر زندگی گزارنے کی سبیل نکل ہی آتی ہے۔

کورونا کی وجہ سے یہ خدشہ تھا کہ شاید ادبی تخلیق کا عمل منجمد اور معطل ہو جائے گا اور لوگ شعروادب سے رشتہ توڑنے پر مجبور ہو جائیں گے مگر ایسا کچھ نہیں ہوا بلکہ تخلیق میں پہلے سے زیادہ تحرک اور طغیانی پیدا ہوئی اور لوگوں نے اپنی فرصت اور وقت کا بہت صحیح استعمال کیا۔ کئی تخلیق کاروں نے ضخیم ناول تک لکھ ڈالے اور اس دوران بہت سی اہم کہانیاں بھی وجود میں آئیں۔ کورونا کے تعلق سے شاعری کا ایک سلسلہ سا چل پڑا اور آن لائن مشاعرے کی ایک نئی روایت قائم ہوگئی۔ کورونا سے متعلق کئی شعری مجموعے بھی وجود میں آگئے۔ وبا کے دنوں میں شعروسخن کو ایک نئی رفتار اور نئی سمت ملی اور اس دوران صرف مرد قلمکار ہی متحرک نہیں رہے بلکہ خواتین نے بھی فرصت کے لمحوں کا بہت مناسب استعمال کیا۔ شعروادب سے دلچسپی رکھنے والی خواتین نے عمدہ شاعری کی۔ متاثر کن افسانے لکھے، تحقیقی اور تنقیدی مقالے بھی تحریر کیے اس طرح تخلیقی عمل رکا نہیں بلکہ جاری رہا۔ خوشگوار بات یہ ہے کہ اس کی وجہ سے بہت سی نئی تخلیقی ذہانتیں بھی سامنے آئیں۔ باصلاحیت افراد جو کسی گوشۂ گمنامی میں تھے ان کے جوہر بھی سامنے آئے اور بہت سی ایسی شخصیات جو اپنی مصروفیات کی وجہ سے شعروادب سے دور ہوگئی تھیں انھوں نے بھی شعروادب سے اپنا سلسلہ جوڑا۔ اس طرح دیکھا جائے تو کورونا نے مثبت اندازِ فکر بھی پیدا کیا اور ایک نیا طرزِ احساس بھی دیا۔ خاص طور پر خواتین نے ان حالات میں اپنی خود اعتمادی اور عزم وہمت کا ثبوت دیا۔ کورونا نے ان کے اندر بھی ایک نئی بیداری پیدا کی اور زندگی کے تعلق سے ان کے کچھ خاص تصورات اور خیالات کو بھی تبدیل کیا۔ صحت جس کے تئیں ایک لاپرواہی کا عمومی رویہ تھا اس تعلق سے بھی رویے میں تبدیلی پیدا ہوئی۔

ہر چیز کے جہاں کچھ منفی اثرات ہوتے ہیں وہیں کچھ مثبت عناصر بھی ہوتے ہیں۔ ہمیں منفیت کو چھوڑ کر مثبت اندازِ فکر اختیار کرنا چاہیے۔ کیونکہ مثبت اندازِ فکر اختیار کرنے سے مشکل راہیں بھی آسان ہو جاتی ہیں۔ کورونا نے ہمیں مشکل حالات میں جینا سکھایا ہے اور زندگی کے نئے آداب بھی بتائے ہیں۔

آپ کا

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

ڈاکٹر سفینہ

دھنک رنگ شاعری کی خالق

پروین شاکر

پروین شاکر عہدِ حاضر کی ممتاز شاعرہ ہیں اور آج بھی برصغیر میں ان کے نام سے مشاعروں میں شمعیں روشن ہوتی ہیں۔ جب بھی ہم ان کی شاعری کو پڑھتے اور سنتے ہیں تو وہ پھولوں کی خوشبو کی مانند مہکتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ خوشبو کے حوالے سے پروین شاکر کا خیال تھا کہ ''حسن جب لطافت کی آخری حدوں کو چھو لے تو خوشبو بن جاتا ہے اور خوشبو حسن کی تکمیل ہے۔'' اور خوشبو کا یہ دلکش سفر پروین شاکر کی شاعری میں بھی جابجا نظر آتا ہے:

چلی ہے تھام کے بادل کے ہاتھ کو خوشبو
ہوا کے ساتھ سفر کا مقابلہ ٹھہرا

عکس خوشبو ہوں بکھرنے سے نہ روکے کوئی
اور بکھر جاؤں تو مجھ کو نہ سمیٹے کوئی
کانپ اُٹھتی ہوں یہ سوچ کے تنہائی میں
میرے چہرے پہ تیرا نام نہ پڑھ لے کوئی

اردو غزل کے طویل سفر میں ایک غیر ضروری پابندی نے اس کی جذبات نگاری پر قدغن لگا دی، نہ جانے کب اور کیسے یہ طے ہو گیا کہ غزل کی زبان میں نسائی انداز غیر معیاری ہو جائے گا اگر خواتین کی زبان میں شاعری کی جائے تو وہ ریختی یا اس سے قریب تر ہو جائے گی۔

مشہور ناول 'امراؤ جان ادا' میں ناول کی ہیروئن برسرِ مشاعرہ یہ شعر پڑھتی ہے:

کعبہ میں آ کے بھول گیا راہ دیر کی
ایمان بچ گیا میرے مولا نے خیر کی

لوگ اعتراض کرتے ہیں بھول گیا کیوں؟ بھول گئی کیوں نہیں تو ادا جواب دیتی ہیں، اے ہے میرن صاحب! میں کیا ریختی لکھتی ہوں۔

پروین شاکر نسائی لب ولہجہ کی شاعرہ ضرور ہیں لیکن ان کے یہاں پاکستان کی بعض دوسری شاعرات کی طرح مرد دشمنی اور مرد بیزاری نہیں ہے، البتہ لاتعداد اشعار ایسے ضرور مل جاتے ہیں جو مرد اور عورت دونوں پر صدفی صد صادق آ سکتے ہیں:

چلنے کا حوصلہ نہیں رُکنا محال کر دیا
عشق کے اس سفر نے تو مجھ کو نڈھال کر دیا

اے میرے گل زمیں تجھے چاہ تھی اک کتاب کی
اہلِ کتاب نے مگر کیا ترا حال کر دیا

چہرہ اور نام ایک ساتھ آج نہ یاد آسکے
وقت نے کس شبیہ کو خواب و خیال کردیا

ملتے ہوئے دلوں کے بیچ اور تھا فیصلہ کوئی
اس نے مگر بچھڑتے وقت اور سوال کردیا

پروین شاکر کی شاعری ان کی زندگی کی آئینہ دار ہے، جس سے ہم کو ان کی زندگی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے اور پروین شاکر نے اس بات کا اعتراف بھی کیا ہے:

اپنی رسوائی تیرے نام کا چرچا دیکھوں
اک ذرا شعر کہوں اور میں کیا کیا دیکھوں

میرے لبوں پہ مہر تھی پر میرے شیشہ رو نے تو
شہر کے شہر کو میرا واقف حال کردیا

پروین شاکر نے بہت شدّت سے محبت کی اور اس محبت میں ناکامی کے باوجود بھی ان کا محبوب چاند کی طرح سدا ان کے ساتھ ساتھ ان کے خیالوں میں رہتا ہے۔ محبوب کی فکر اس کی دلجوئی اور اُس کا عکس اپنی اولاد کی شکل میں دیکھنے کی خواہش ان کی شاعری میں جابجا نظر آتی ہے:

سب ضدیں اُس کی پوری کروں، ہر بات سنوں
اک بچے کی طرح سے اُسے ہنستا دیکھوں

تو میری طرح سے یکتا ہے مگر میرے حبیب
جی میں آتا ہے کوئی اور بھی تجھ سا دیکھوں

تو میرا کچھ نہیں لگتا ہے مگر جانِ حیات
جانے کیوں تیرے لیے دل کو دھڑکتا دیکھوں

پروین شاکر کی شاعری میں خوابوں کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان کے یہاں کہیں خواب ٹوٹنے کا درد ہے تو کہیں خواب دکھانے والے کا احترام ہے۔ حالانکہ پہلے وہ خواب دکھانے والا اسی شدت سے ان کے خوابوں کی تعبیر کا خواہش مند تھا، لیکن آج وہی انسان خوابوں کا دشمن بن گیا ہے، اس کے باوجود اس انسان سے وہ نفرت نہیں کرتیں بلکہ اُس اچھے وقت کو یاد کر کے اُس کا احترام کرتی ہیں اور خوابوں کو مختلف طرح سے بیان کرنا پروین شاکر کی شاعری کی اہم خصوصیت ہے:

جو خواب دینے پر قادر تھا میری نظروں میں
عذاب دیتے ہوئے بھی مجھے خدا ہی لگا

نہ دے سکا مجھے تعبیر خواب تو بخشے
میں احترام کروں گی تیری بڑائی کا
جس طرح خواب میرے ہو گئے ریزہ ریزہ
اس طرح سے نہ کبھی ٹوٹ کہ بکھرے کوئی

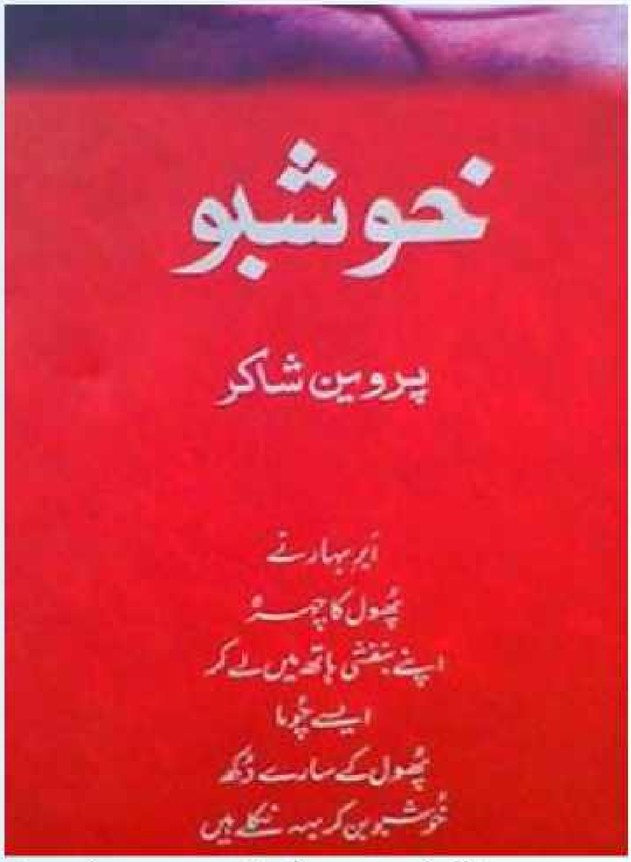

پروین شاکر کے یہاں ایسا تجربہ بھی ملتا ہے جہاں انھوں نے اپنوں سے بہت چوٹ کھائی ہے اور کسی تے ان کو بنا کر پائمال کرنے کی کوشش کی ہو یا خواب دے کر چھیننے کی جو کل تک ان کا اپنا تھا آج وہی ان کا مقابل ہوگیا ہو جیسے کوئی ماں اپنے بچے کو نو مہینے اپنے خون سے سینچے اور پھر اُسی اولاد کو پائمال کردے:

تعلقات کے برزخ میں ہی رکھا مجھ کو
وہ میرے حق میں نہ تھا خلاف بھی نہ ہوا

لہو سے سینچ دیا اور پھر یہ طے پایا
اسی گلاب کو اب پائمال کرنا ہے

انھیں تجربات کے ردِّعمل میں انھوں نے درد کا اظہار بھی خوب کیا ہے:

میں سچ کہوں گی مگر پھر بھی ہار جاؤں گی
وہ جھوٹ بولے گا اور لاجواب کر دے گا

کون جانے کہ نئے سال میں تو کس کو پڑھے
ترا معیار بدلتا ہے نصابوں کی طرح

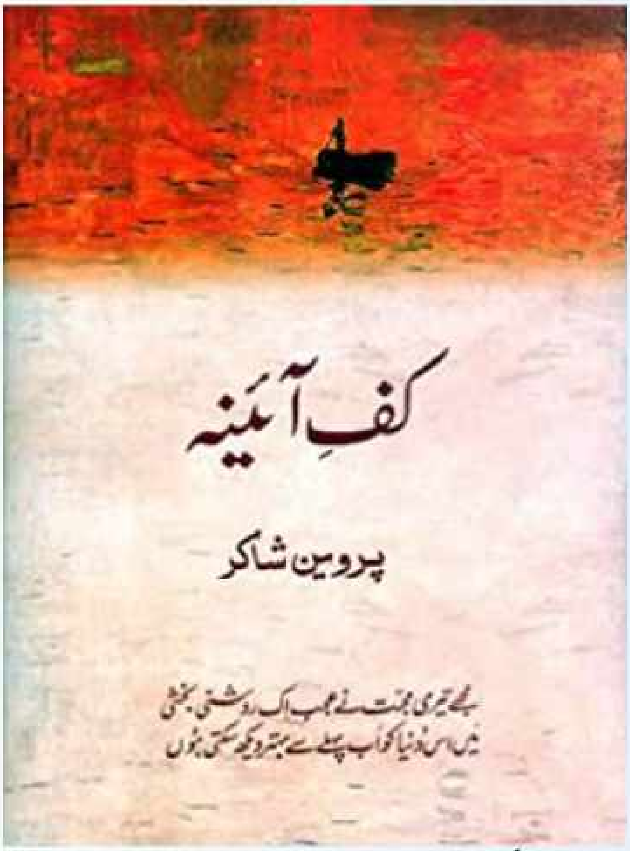

جب کسی سے تعلقات خراب ہوجاتے ہیں تو لوگ اُسے اور زیادہ پوچھنے لگتے ہیں اور تعلقات خراب ہونے کی وجہ تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔لیکن کسی سے شدت سے محبت کرنے کی سزا یہ ملتی ہے کہ اُس سے بغیر کسی قصور کے تعلقات منقطع ہوجائیں تو اس کا جواب دوسروں کو تو کیا اپنے آپ کو بھی دینا ممکن نہیں۔ پروین شاکر کے یہاں اَنا تو ہے لیکن وہ اپنے دل کے ہاتھوں اتنی بے بس ہیں کہ اپنے محبوب کے بغیر بھی وہ اسی کے خیالوں میں جی رہی ہیں۔ اور اپنے ہرجائی کے لوٹ کر آنے کو ہی وہ غنیمت جانتی ہیں۔ ''جیسے صبح کا بھولا شام کو گھر آجائے تو اُسے بھولا نہیں کہتے۔'' پروین شاکر محبت میں بیشتر جگہ اپنے محبوب کی برائی میں بھی اچھائی تلاش کرتی ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے وہ اپنے آپ کو کہیں نہ کہیں تسلی دے رہی ہیں۔محبوب سے جدائی کا درد، اکیلا پن اور پھر محبوب کا لوٹ کر آنا، خود کلامی کی کیفیت بھی پروین شاکر کے یہاں موجود ہے:

کوئی سوال جو پوچھے تو کیا کہوں اُس سے
بچھڑنے والے سبب تو بتا جدائی کا
کیسے کہہ دوں کہ چھوڑ دیا ہے اُس نے مجھے
بات تو سچ ہے مگر بات ہے رُسوائی کی

وہ کہیں بھی گیا لوٹا تو میرے پاس آیا
بس یہی بات ہے اچھی میرے ہرجائی کی

پروین شاکر کی شاعری میں تسلسل، استفہامیہ انداز اور شکوہ کرنے کا انوکھا انداز موجود ہے جہاں وہ اپنے محبوب پر اُس کی بے وفائی کے تیر برسا رہی ہیں اور یہ غیرت دلانے کی کوشش کررہی ہیں کہ میرے ہونے نہ ہونے کا تم پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اکثر انسان یا کسی بھی چیز کی اہمیت وہاں کم ہوجاتی ہے جہاں اُس کا بدل مل جاتا ہے۔ کہیں نہ کہیں پروین شاکر کے محبوب کو بھی اُن کا بدل مل گیا ہے، جس کا شکوہ پروین شاکر نے کیا ہے جو طنز سے لبریز ہے اور وہ ان کی شاعری کے حسن کو اور بھی دوبالہ کردیتا ہے:

ٹوٹی ہے میری نیند مگر تم کو اس سے کیا
بجتے رہے ہواؤں سے در تم کو اس سے کیا

تم موج موج مثلِ صبا گھومتے رہو
کٹ جائیں میری سوچ کے پر تم کو اس سے کیا

اوروں کا ہاتھ تھامو انھیں راستہ دکھاؤ
میں بھول جاؤں اپنا ہی گھر تم کو اس سے کیا

لے جائیں مجھ کو مالِ غنیمت کے ساتھ عدو
تم نے تو ڈال دی ہے سپر تم کو اس سے کیا

تم نے تو تھک کہ دشت میں خیمے لگا لیے
تنہا کٹے کسی کا سفر تم کو اس سے کیا

پروین شاکر نے بارش اور آنسوؤں کا رشتہ جوڑ کر بارش میں عورتوں اور کسانوں کی کیفیت پر روشنی ڈالنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ حالانکہ نسائی لب و لہجہ والی شاعرہ ہونے کے باوجود انھوں نے جو کسانوں کی کیفیت بیان کی ہے، وہ قابلِ تعریف ہے:

تیرا گھر اور میرا کا جل بھیگتا ہے ساتھ ساتھ
ایسی برساتیں کہ بادل بھیگتا ہے ساتھ ساتھ
بارشیں جاڑوں کی اور تنہا بہت میرا کساں
جسم اور اکلوتا کمبل بھیگتا ہے ساتھ ساتھ

یہی رہا مقدر میرے کسانوں کا
کہ چاند بوئیں اور ان کو گہن زمیں سے ملے

اکثر اور بیشتر ناقدین کی رائے یہ ہے کہ ان کی شاعری کمسن لڑکیوں کی شاعری ہے۔ لیکن میں سمجھتی ہوں ان کی شاعری مکمل عورت کی ترجمانی کرتی ہے، جس میں زندگی کے نشیب وفراز اور اپنے تجربات وہ اپنے بچے میں منتقل کرنے کی کوشش کرتی ہیں اور بہت چوٹ کھانے کے باوجود بھی وہ اپنے بچے کو وہی درس دیتی ہیں جو کبھی ان کے والد نے ان کو دیا تھا۔

پروین شاکر کی شاعری میں دُکھ درد ہونے کے باوجود بھی نا اُمیدی اور بے زاری نہیں حالانکہ ان کی ازدواجی زندگی کامیاب نہ رہی اور رشتوں کے ٹوٹنے کا درد بھی اُن کی شاعری میں نظر آیا:

میرے چھوٹے سے گھر کو کس کی نظر اے خدا لگ گئی
کیسی کیسی دعاؤں کے ہوتے ہوئے بددُعا لگ گئی

گھر کے مٹنے کا غم تو ہوتا ہے
اپنے ملبے پہ کون سوتا ہے

اتنے درد کے باوجود بھی وہ اندھیرے میں اُمید کی کرن تلاش کر ہی لیتی ہیں۔

پروین شاکر کا خیال تھا ’شجر کتنا ہی ویران کیوں نہ ہو، پر اُمید بہار پیوستہ ہے۔ پھول کتنا ہی پائمال کیوں نہ ہو اچھے دنوں پر یقین کرنے والے کوئی نہ کوئی شگون لے ہی لیتے ہیں اور اس یقین کی کوئی ننھی سی کرن آپ کے دل تک بھی اُتر سکے تو میں سمجھوں گی میرے وجود کی ایک پنکھڑی زرق ہونے سے بچ گئی‘۔

رات کو مان لیا دل نے مقدر لیکن
رات کے ہاتھ پہ اب کوئی دِیا چاہتا ہے
ریت ہی ریت ہے اس دل میں مسافر میرے
یہ صحرا ترا نقشِ کفِ پا چاہتا ہے

پروین شاکر اپنی ہم عصر شاعرات میں منفرد شخصیت اور منفرد لب و لہجے کی مالک ہیں۔ ان کے یہاں ہوا، پانی، خوشبو، بادل اور ان کے خوابوں کی ایک الگ دنیا آباد ہے۔ ان کو اپنے محبوب کے یکتا ہونے اور اپنے اکیلے پن کا خوب اندازہ تھا اور اُن کے اکیلے پن کا چاند بھی گواہ تھا۔ وہ چاند جیسی شاعرہ اپنے چاند سے خوب باتیں کرتی ہیں۔ انھوں نے چاند اور اپنی مماثلتوں کا بھی شاعری میں ذکر کیا ہے۔

اس کے علاوہ پروین شاکر کی شاعری میں ضبط کی مثالیں بھی خوب موجود ہیں۔ کبھی ان کا محبوب ان کو چھوڑ کر چلا جاتا ہے، کبھی پاس آجاتا ہے تو کبھی ان سے گلہ بھی کرتا ہے۔ اس گلے کو پروین شاکر نے بڑے ہی دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے:

مدتوں بعد اُس نے آج مجھ سے کوئی گلہ کیا
منصبِ دلبری پہ کیا مجھ کو بحال کر دیا

پروین شاکر کے انتقال کو تقریباً 28 برس ہوگئے ہیں لیکن یہ شاعرہ مرکر بھی زندہ ہے۔ دن بہ دن پروین شاکر کی مقبولیت میں اضافہ ہو رہا ہے، ان کے کلّیات کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ شاید پروین شاکر کو اپنے مرکر بھی زندہ رہنے کا بخوبی اندازہ تھا:

مر بھی جاؤں تو کہاں لوگ بھلا ہی دیں گے
لفظ میرے مرے ہونے کی گواہی دیں گے

واقعی پروین شاکر ہمیشہ زندہ اور پائندہ رہنے والی شاعرہ ہیں۔ جن کو بھی نہیں بھلایا جاسکتا، ان کی شاعری سدا خوشبو کی مانند مہکتی رہے گی اور وقت کے ساتھ ساتھ یہ خوشبو بڑھتی ہی جائے گی۔

Dr. Safina
Assistant Professor
Zakir Husain College
New Delhi 110001

شاعرات کے منتخب اشعار

کہاں سے آتی کرن زندگی کے زنداں میں
وہ گھر ملا تھا مجھے جس میں کوئی در ہی نہ تھا

اک دوسرے کو جان نہ پائے تمام عمر
ہم ہی عجیب تھے کہ زمانہ عجیب تھا

پروین شاکر

ہم اسے اپنے لیے محدود سمجھے تھے مگر
اب کھلا اس چاند پر عرصے سے تھی گھر گھر کی آنکھ

اکھڑ گئے ہیں مرے دائروں کے سارے شجر
مقابلہ ہے نئے سورجوں کی حدت سے

حمیرا رحمٰن

میں پھول پھول سفر کر رہی تھی خوابوں کا
پھوار لائی تھی تحفہ نئے گلابوں کا

کسم کے پھول مرے گھر میں وہ لگا ہی گیا
یہ رنگ میرے دوپٹے کو راس آ ہی گیا

عشرت آفرین

حسرت تعمیر میں مٹی مری برباد ہو
جرأت اظہار دیواروں میں چنوائے مجھے

کیا جانے کسی پیاس کے کام آنے کی راحت
کوزے میں سمندر نے سمٹ کر نہیں دیکھا

نسیم سید

ہوائیں کرتی ہیں سرگوشیاں سی آنگن میں
نہ جانے آئیں گے کس کے قدم چراغ جلے

ہر دور کا جو عکس ہے وہ آئینہ ہیں ہم
تخلیق کائنات کا اک سلسلہ ہیں ہم

ملکہ نسیم

حرف محتاط کی تفسیر مجھے دیتا جا
جو سند ہو وہی تحریر مجھے دیتا جا

اس قدر تجھ سے ہوں مانوس نہ کر مجھ کو رہا
وہی حلقے وہی زنجیر مجھے دیتا جا

امّ ہانی

ایک چھوٹی سی بات ہے پنہاں
دل میں اک کائنات ہے پنہاں

خودشناسی بھی ہے تو بس اتنی
مجھ میں اک اور ذات ہے پنہاں

سکینہ ساجد پنہاں

روشنی کی جہاں حکومت تھی
اب اندھیروں کا زور چلتا ہے

کاٹ دیتی ہے سر درختوں کے
کبھی ایسی ہوا بھی چلتی ہے

شائستہ یوسف

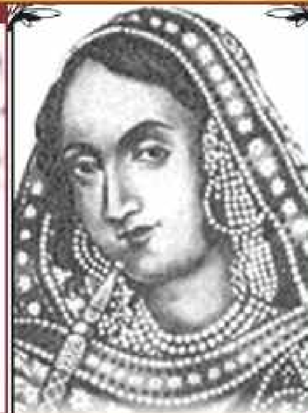

شاہ جہاں بیگم

تحریک آزادی میں مسلم خواتین کا کردار

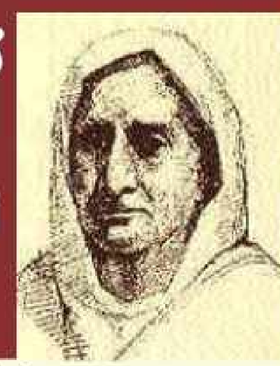

میں اپنے مقالہ میں اُن مسلم خواتین کا تذکرہ کر رہی ہوں جو 1930 کے نزدیک اور اس کے بعد کے زمانے میں براہِ راست گاندھی جی اور دیگر رہنماؤں کے خیالات و نظریات کے زیر اثر قومی محاذ آرائی میں شامل ہوئیں۔ ان خواتین کی زیادہ تعداد اسکول اور کالج سے فارغ شدہ تھی ہندو مسلم اتحاد، عدم تشدد، دیہی ترقی، تعلیم بالغاں ہری جنوں کی فلاح و بہبود کے تعمیری منصوبے" اور وہ کھل کر عوامی جلسوں میں شریک ہوئیں ولایتی کپڑوں اور شراب کی دکانوں پر دھرنا دیا۔ ان کی اکثریت قید و بندکی صعوبتوں کی تلخ چاشنی سے مانوس ہوئیں۔ ان کی سیاسی سرگرمیوں کا ایک ہی مقصد آزاد ہندوستان تھا۔ ان خواتین میں سے اکثر نے بعد میں آزاد غیر مذہبی جمہوری ہندوستان کی تعمیر میں نمایاں کردار ادا کیا۔ مقالہ کی طوالت کے خوف سے میں نے منتخب خواتین کی تحریک آزادی میں قربانیوں سے اُس پہلو کا احاطہ کرنے کی سعی کی ہے جس کو انھوں نے سرکاری جیل میں رکھا۔

بیگم محبوب فاطمہ دہلی کی وہ مسلم خاتون ہین جنھیں سزا سنائی گئی۔ اخبار میں شائع شدہ خبر سے ملاحظہ ہو:

"دہلی 21/اپریل بیگم محبوب فاطمہ (مسز طاہر محمد) جن کو بہن ستیہ وتی کے ہمراہ جلیانوالہ باغ کے سلسلے میں چاندنی چوک سے گرفتار کیا گیا تھا۔ ان کو آج مسٹر اے.ایس. ایڈشنل مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش کیا گیا۔ آپ کے خلاف دفعہ 17/الف ترمیم قانوں ضابطہ فوجداری کے ماتحت مقدمہ چلایا گیا تھا۔ آپ نے عدالت کی کارروائی میں حصہ لینے سے انکار کردیا۔ عدالت نے آپ کو چھ ماہ قید محض و پچاس روپے جرمانے کی سزا دی عدم ادائے جرمانہ آپ کو ڈیڑھ ماہ مزید قید بھگتنی ہوگی۔" (مدینہ اخبار بجنور -25/اپریل 1932)

"مدراس سٹی کانگریس کی آٹھویں ڈکٹیڑی سوا بیگم کو پکٹنگ کے سلسلے میں ایک سال قید محض اور پچاس روپے جرمانہ کی سزا دی گئی۔" (مدینہ اخبار، بجنور 21/فروری 1932)

آمنہ قریشی ہندوستانی نسل کے جنوبی افریقہ میں مقیم امام عبدالقادر باوزیر کی چھوٹی بیٹی تھیں۔ امام صاحب گاندھی جی کے انتہائی قریبی ساتھیوں میں سے تھے اور جنوبی افریقہ کی سعی امتیاز کی پالیسی کے خلاف جدو جہد میں برابر کے شریک تھے۔ ٹرانسوال میں مذہبی درس وتدریس کے سبب وہ امام صاحب کے نام سے مشہور ہوگئے تھے۔ آمنہ قریشی کو جذبہ قوم پرستی اور حب الوطنی ورثے میں ملا تھا۔ امام صاحب کا جنوبی افریقہ میں عربی گھوڑوں کا بہت بڑا کاروبار تھا۔ وہ سب کچھ چھوڑ کر ہندوستان کی جنگِ آزادی میں شرکت کی خاطر گاندھی جی سے آملے۔

آمنہ کے والد امام صاحب کی صحت جیل میں خراب ہوگئی تھی۔

رہائی کے کچھ عرصے بعد ہی 9 /دسمبر 1931 میں ان کا انتقال ہوگیا۔ باپو نے ان کے انتقال پر نوجیون (گجراتی) مورخہ 17 /دسمبر 1931 میں ان کے تفصیلی حالاتِ زندگی کے تذکرے میں لکھا ہے۔ ’’ہندوستان آنے پر پہلے ان کی بیوی کا انتقال ہوا پھر بڑی بیٹی فاطمہ کا اور اب وہ خود چلے گئے۔ ان کی یادگار اب اُن کی بیٹی آمنہ اور داماد غلام رسول قریشی ہیں۔ دونوں ہی ملک وقوم کی خدمت میں مصروف ہیں مجھے خود اُن کی وفات سے گہرا صدمہ ہوا ہے ان کا انتقال میرے پہنچنے سے پہلے ہی ہوگیا اس کا مزید غم ہے۔‘‘

خواتین کو ڈانڈی مارچ شرکت کی اجازت نہیں ملی تو سب خواتین نے مل کر شراب اور ولایتی کپڑے کی دکانوں پر باپو کے حکم سے پر پکٹنگ کیا۔ اس ضمن میں اقتباس ملاحظہ ہو :

> ’’باپو نے گجرات کی خواتین کو شراب اور ولایتی کپڑے کی دکان پر پر پکٹنگ کرنے کا حکم دیا۔ گجرات کے کونے کونے سے خواتین نے اس کا خیر مقدم کیا۔ ریحانہ طیب جی، حامدہ بہن اور آمنہ قریشی بھی ان میں شامل تھیں۔ ’’نورساری‘‘ میں آمنہ قریشی کو گرفتار کیا گیا اور انھیں چھ ماہ کی قید ہوئی۔‘‘

(نوٹس کشن بھائی ترویدی، تذکرہ سے ماخذ ڈاکٹر عابدہ سمیع کی تصنیف، تحریک آزادی میں مسلم خواتین کا حصہ، ص:201)

بی بی امت السلام ایک جاگیردار محب وطن خاندان میں 1907 کو موتی باغ محل پٹیالہ میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد عبدالحمید خاں ریاست پٹیالہ میں وزیر مالیات تھے۔ بی بی امت السلام نے بچپن سے آزاد طبیعت پائی تھیں۔ 1930 کو ستیہ گرہ کے دوران 25 سال کی عمر میں آزادی کی تڑپ محبت وعقیدت سے بھر پور دل لیے وہ تمام سماجی بندشوں کو توڑ کر گاندھی جی کے سابرمتی آشرم پہنچی تھیں۔ بقول مولانا ابوالکلام آزاد کے گاندھی پہلے شخص تھے جنھوں نے مسٹر جناح کے لقب ’’قائدِ اعظم‘‘ کو رواج دیا۔ بی بی امت السلام کے توجہ دلانے پر لکھنا شروع کیا تھا۔

1922 کو ان کے بڑے بھائی عبدالرشید خاں ضلع کانگریس کمیٹی کے صدر کی حیثیت سے چھ ماہ کے لیے جیل گئے۔ قوم پرستی کا جوش بڑھ رہا تھا۔ بیرسٹر کی تعلیم ادھوری چھوڑ دی۔ بی بی امت السلام نے برقعہ پہن کر انبالہ کی گلی گلی میں کھادی کی تبلیغ اور کھادی فروخت کرنا شروع کیا۔ بیگم محمد علی جوہر اور ان کی والدہ ’’بی اماں‘‘ کے اکثر پنجاب کے دورے میں ساتھ شرکت کیا کرتی تھیں۔

ڈاکٹر عابدہ سمیع اپنی کتاب ’ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلم خواتین کا حصہ (ص-217) میں بی بی ساتھ امت السلام کے جیل جانے کے متعلق تحریر کرتی ہیں:

> ’’1923 میں جب باپو نے سابرمتی آشرم کو ختم کر کے جن دوسرے آشرم والوں کے ساتھ راس گاؤں کی طرف کوچ کیا تو بی بی امت السلام بھی ساتھ تھیں۔ آشرم کی دوسری خواتین کے ساتھ انھیں جیل بھیج دیا گیا۔

1932 میں ستیہ گرہ بند ہونے پر وہ بھی رہا ہوئیں تو جیسے ان کی زندگی کا ایک نیا باب شروع ہوا۔ باپو کی شفقت نے انھیں مستقبل کی ایک نئی جہت عطا کی تھی۔

گول میز کانفرس سے باپو کی واپسی کے بعد بی بی امت السلام نے ہندو مسلم اتحاد کو اپنی زندگی کا نصب العین بنالیا تھا۔ یہی وہ مشن تھا جس کی خاطر خود انھوں نے اپنی جانِ عزیز کی قربانی دی۔

> ’’گھنے جنگلوں سے گذرتی، گھوڑوں پر سوار بی بی امت السلام بے خوف ہوکر فساد زدہ علاقوں میں پہنچیں اور فساد ختم کرانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔‘‘ (ایضاً، ص:218)

1965 میں ہندو پاک جنگ کے دوران لوگوں کی مدد کے لیے لداخ جاتی تھیں۔ سرحدی گاندھی مرحوم خان عبدالغفار خاں صاحب 1969 میں ہندوستان آئے تو ان کا کھانا خود بناتی تھیں۔

بیگم سکینہ لقمانی جسٹس بدرالدین طیب جی کی بیٹی تھیں ان کے شوہر مسٹر لقمانی بمبئی کے مشہور ڈاکٹر تھے۔ ایک شعبہ کی صدر بھی تھیں۔ مہاتما گاندھی ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔ اس کا اندازہ اس خط سے بہ خوبی ہو رہا ہے:

''ریحانہ طیب جی کے نام اپنے خط مورخہ 29 رجولائی 1930 میں ان کی خیریت معلوم کرنے کے لیے گاندھی جی نے لکھا تھا۔ ''لقمانی کیسی ہیں؟ طیب جی خاندان نے اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کا بھر پور مظاہرہ کیا ہے''۔

(Collected Works, Vol XLIV, July December, 1930. P.54)

بیگم لقمانی شراب کی دکانوں پر دھرنا دینے کے لیے دور ہی بیٹھی تھیں۔ رعب اتنا تھا کہ کوئی خریدار دکان تک پہنچتا ہی نہیں۔ دکان داروں نے ان پر تشدد بھڑکانے کا الزام لگایا۔ سکینہ لقمانی کو گرفتار کرلیا گیا۔ کرلا (ضلع تھانہ) میں مقدمہ چلا، چار مہینے بامشقت کی سزا سنائی گئی اُس وقت اُن کی عمر 65 سال تھی۔ سزا کی خبر سن کر بمبئی کی خواتین نے جلوس نکالا مختلف لوگوں نے اخبار میں اپنا احتجاج کیا۔ بمبئی کرانیکل میں شائع ایک خط بنام اڈیٹر کے ملاحظہ ہوں:

''جناب ایڈیٹر ہم دیش سیوکائیں اس معزز و محترم دیشی سیو کا کی خدمت میں نذرِ عقیدت پیش کرتی ہیں جنھیں اس عمر میں 4 ماہ قید بامشقت کی سزا سنائی گئی ہے مسز لقمانی کا جرم کیا ہے؟ یہ سزا ایک ایسے کام کے لیے ہے، جس کام پر ہر ملک و مذہب میں اس شخص کی عزت کا تاج پہنایا جاتا ہے، جس نے اپنے ہم وطنوں کو صحیح راستے پر چلانے کی کوشش کی ہو''

(بمبئی کرانیکل 10 رجولائی 1930)

انڈین نیشنل کانگریس کی جہدِ آزادی میں قربانیوں کی داستان ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے اہم کردار کے تذکرے کے بغیر نہ ہو سکے گی۔ جن کے قومی جوش اور مجاہدانہ جذبے کو سیاسی نشیب وفراز قیدِ فرنگ اپنے اور بیگانوں کی خفگی بھی متزلزل نہ کرسکی۔ انصاری صاحب کی غیر معمولی فعال زندگی کے پس پشت شمس النساء بیگم انصاری کا کردار بھی بہت اہمیت رکھتا ہے۔ وہ میدانِ عمل میں ان کی برابر کی شریک تھیں۔

''بیگم انصاری سیاسی عقائد کے اعتبار سے بھی انصاری صاحب کی ہم عقیدہ تھیں مثلاً دہلی ویمنس خلافت کمیٹی کی سر براہ بیگم اجمل خاں اور بیگم انصاری نے بی اماں کی دورانِ ملاقات خواتین کی آٹھ نشستوں کا اہتمام کیا اور دو ہزار سے اوپر چندہ جمع کیا۔''

Call Ninnult : The Khilaf Movement P: 150

بیگم انصاری کا انتقال 1948 میں انصاری صاحب کے دو سال بعد ہوا۔ زہرہ انصاری ڈاکٹر انصاری کی بھانجی اور گود لی ہوئی بیٹی تھیں۔ آزادی کی لڑائی میں انھوں نے بھی گاندھی جی کا ساتھ دیا۔ زہرہ انصاری جنگِ آزادی میں جیل جانے کی بھی خواہش مند تھیں۔ وہ جیل گئیں یا نہیں معلومات حاصل نہ ہوسکی۔ ان کی شادی شوکت انصاری سے ہوئی جو ڈاکٹر انصاری کی بہن قمر النساء کے بیٹے تھے۔

''زہرہ انصاری'' دارالسلام ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی دہلی رہائش گاہ کا نام ہے جس کے معنی امن وسلامتی کا گھر کے ہیں۔ دارالسلام کے سلسلے میں بھی ان کی قربانی نظر انداز کیے جانے کے قابل نہیں۔ اس گھر کی اہم تاریخی حیثیت ہے کہ اس زمانے کے سبھی علمائے کرام کی میزبانی کا بھی اسے شرف حاصل رہا ہے۔ سوراج پارٹی کی اہم نشستیں بھی یہاں پر ہوئی ہیں۔ زہرہ انصاری صاحبہ کے بیان کے مطابق اس گھر کو اسی انداز پر قائم رکھنا ہمارے لیے بڑا مشکل تھا۔ ہم نے ارادہ کیا کہ ایک چھوٹے مکان میں منتقل ہو جائیں اور ''دارالسلام'' کو کرائے پر اٹھا دیں۔ ہمارے دوستوں کا مشورہ تھا کہ ہم انجمن ترقی اردو کو دے دیں لیکن اچانک 1926 میں الیکشن

کا مرحلہ درپیش ہوا۔ میرے شوہر نے محسوس کیا کہ قوم پرست مسلمانوں کے لیے یہ ایک بڑا نازک وقت ہے مسلم لیگ سے مورچہ سخت ہے اور پیسوں کا انتظام انتہائی دشوار۔ میں نے اس وقت اپنے شوہر کی مدد کی اور ورثے میں ملے اپنے اس گھر کو جس کا رقبہ بارہ ہزار اسکوائر یارڈ تھا فروخت کر کے اس رقم سے یوپی میں الیکشن بندوبست کرنے کا فیصلہ کیا۔''

Zohra Ansari Cral History Transcript Part I

ان کا انتقال 28 / جولائی 1985 کو انگلینڈ میں ہوا اور وہیں پر تدفین ہوئی۔

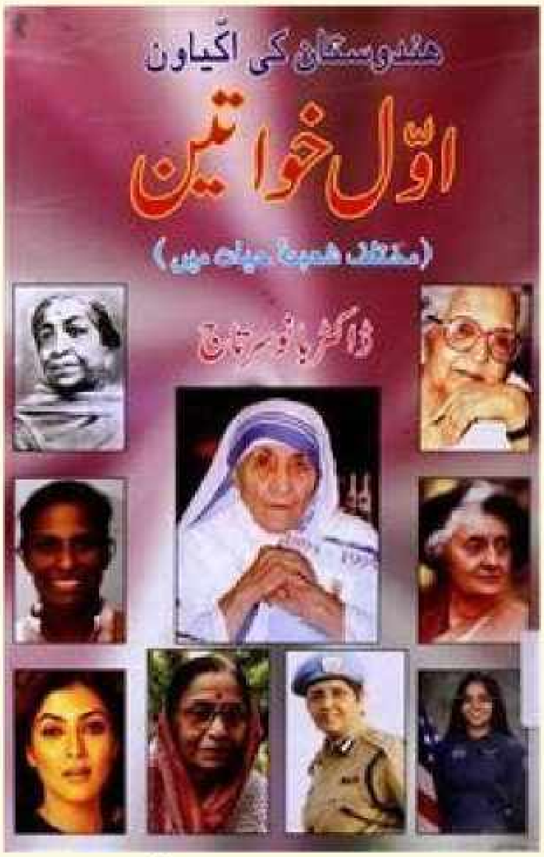

مائی بخت آور ایک سندھی کسان خاتون تھیں۔ جو لاشاری کے کسانوں کے اناج کی حفاظت کرتے ہوئے شہید ہوگئیں۔ اس واقعہ کا ذکر ڈاکٹر عابدہ سمیع الدین تصنیف (ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلم خواتین کا حصہ، ص:207) میں تحریر کیا ہے:

> ''1946 کا واقعہ ہے زمیندار کے آدمیوں نے لاشاری کے کسانوں کے اناج پر زبردستی قبضہ کرنا چاہا تو اور گاؤں والوں کے ساتھ مائی بخت آور نے بھی بڑی بہادری سے مزاحمت میں حصہ لیا۔ پولیس نے نہتے کسانوں پر فائرنگ کی اور 24 جون 1946 میں مائی بخت آور اس فائرنگ میں شہید ہوگئیں۔ ان کے آخری الفاظ تھے ''دیکھو وہ ہمارا اناج نہ لے جاسکیں''۔

اس فائرنگ میں ان کے شوہر بھی زخمی ہوئے۔ لاشاری گاؤں میں مائی بخت آور کی شہادت کو آج بھی یاد کیا جاتا ہے۔

ارونا آصف علی نے 9/ اگست 1942 کو ممبئی کے گوالیا ٹینک میدان پر یونین جیک ہٹا کر بھارت کا ترنگا جھنڈا لہرایا تھا۔ دلی کی اول میئر ہونے کا اعزاز بھی ارونا آصف علی ہی کے نام جاتا ہے۔

ڈاکٹر بانو سرتاج اپنی تصنیف ہندوستان کی اکیاون ''اوّل خواتین (مختلف شعبہ حیات میں) میں تحریر کیا ہے:

> ''1930 میں نمک ستیہ گرہ کے وقت ہی ان کی سیاسی اہمیت واضح ہوگئی تھی۔ اس میں دوسری خواتین کو چھ چھ ماہ کی سزائیں دی گئیں اور انھیں ایک سال کی سزا سنائی گئی۔ پھر گاندھی ارون سمجھوتے کے تحت سیاسی قیدیوں کو رہا کر دیا گیا مگر ارونا کو رہائی نہیں ملی (ص:82)

دلی جیل میں رہتے ہوئے ارونا نے قیدیوں کے ساتھ ہونے والے خراب سلوک کے خلاف آواز اٹھائی بھوک ہڑتال کی اور افسروں سے اپنی مانگیں پوری کروائیں۔ اس ''نہتا گیری'' کی سزا یہ دی گئی۔ انھیں انبالہ جیل منتقل کرنے کے بعد بھی انھیں دوسرے قیدیوں سے الگ رکھا گیا۔ 1942 میں ایک کرانتی کی اہم نیتا کی شکل میں سامنے آئیں۔

دلی کے ایک جلسہ میں انھوں نے عوام کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

> ''بھارت کی آزادی کے معاملے میں انگلینڈ سے کوئی سمجھوتہ نہیں ہوسکتا۔ بھارتیہ اپنا حق لے کر رہیں گے۔ ہم ان سے بھیک مانگنے نہیں جائیں گے''

(ص:83)

سول نافرمانی تحریک سے لے کر جب تک زندہ رہیں کھادی ہی پہنتی رہیں۔ آصف علی سے شادی کی اور ایک کامیاب ازدواجی زندگی گزاری۔

اگر دیکھا جائے تو تحریک آزادی میں خواتین کی شرکت اس سے بڑھ کر اور کیا ہوسکتی ہے کہ جس زمانے میں ان کے مجاہد شوہر جیلوں میں چکی کی مشقتیں برداشت کیا کرتے تو ان کی ہمدم و ہمساز رفقائے حیات گھروں کا انتظام ہی نہیں سنبھالتی تھیں بلکہ ہر طرح کی معاشی سختیوں، ذہنی اُلجھنوں اور دیگر پریشانیوں کے باوجود اپنے شوہروں کے حوصلے بڑھاتیں اور دوسرے اسیرانِ آزادی کے خاندانوں کی بھی دیکھ بھال کرتی تھیں سخت

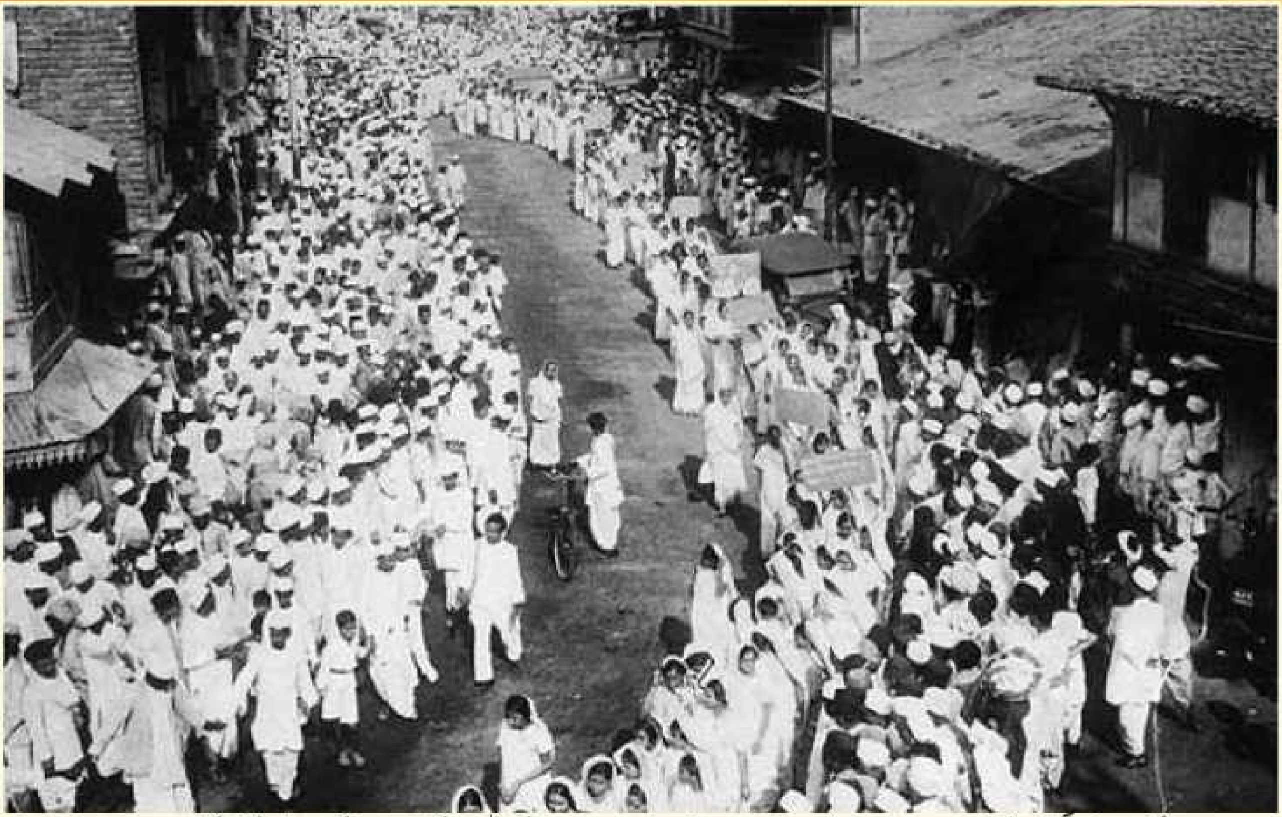

سے سخت آزمائش میں بھی کبھی کوئی شکوہ ان کے لبوں پر نہیں آیا۔ان خواتین میں حضرت محل، بی اماں، بیگم حسرت موہانی، زلیخا بیگم (بیگم مولانا آزاد) امجدی بیگم (بیگم مولانا محمد علی) سعادت بانو کچلو، بیگم خورشید، محبّ وطن ز.خ.ش.، خدیجہ بیگم، زبیدہ بیگم، کنیز سیدہ بیگم، بیگم صاحبہ مولوی ظفر علی خاں، بیگم ڈاکٹر محمد عالم، اکبری بیگم وغیرہ ہیں۔

تاریخ شاہد ہے کہ آزادی کے ہر موڑ پر مسلم خواتین نے اپنے بھائیوں کے دوش بدوش حصہ لیا۔تحریک عدم تعاون ہو یا انگورہ فنڈ کے لیے چندہ جمع کرنے کا کام خواتین ہر موقع پر پیش پیش رہیں۔سودیشی کو عام کیا اور ولایتی کپڑوں میں آگ لگادی۔خلافت فنڈ میں روپیوں اور زیور کے ڈھیر لگ گئے ۔ بی اماں کے طوفانی دوروں، حکومت مخالف تقاریر اور چندے کی فراہمی بخوبی انجام دیں۔اس بات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ خلافت کے ان چندوں سے گاندھی جی نے ہندوستان کے طول وعرض کا دورہ کیا۔گاندھی جی کو عوام سے روشناس کرانے میں خلافت کے چندوں کا اہم کردار ہے۔

قومی تحریک پر اردو میں بہت کم مواد دستیاب ہے اور بہت سے نام ہیں جو اس جدوجہد کا حصہ رہیں۔فاطمہ عریض، اہلیہ طیب جی، ریحانہ طیب جی، حمیدہ طیب جی، فاطمہ طیب جی، شفاعت النساء بی بی، بیگم ماجدہ بانو، بیگم کلثوم سایانی، فاطمہ اسماعیل بیگم، سلطانہ حیات انصاری، ہاجرا زیڈ احمد، ماجدہ حسینہ بیگم، ظہیرہ بیگم، سلطانہ بیگم، فاطمہ بیگم، بیگم صفیہ عبدالواجد وغیرہ۔ یہی نہیں بلکہ سینکڑوں ایسی مسلم خواتین رہی ہوں گی جن کی قربانیاں آج ماضی کے دھندلکوں میں گم ہو چکی ہیں۔

بحیثیت مجموعی یہ سبھی خواتین پردہ نشین تھیں اپنے زمانے کے معاشرتی تناظر میں ان خواتین کا بیدار سیاسی شعور اور قومی سیاسی زندگی میں اُن کی شرکت قابلِ تحسین اور ایک انتہائی جرات مندانہ اقدام تھی جس کا تصور ہم آج کے معاشرے میں مشکل سے کر سکتے ہیں۔

کتابیات:

1.ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلم خواتین کا حصہ،ڈاکٹر عابدہ سمیع الدین،1995 ادارہ تحقیقات اردو پٹنہ۔
2.تحریک آزادی میں مسلم خواتین کا حصہ (مترجم تلگو) سید نصیر احمد، 2006 تلگو پبلکیشن ، حیدرآباد، اے۔پی۔
3.ہندوستان کی عظیم عورتیں،صفدر حسین،1988، ترقی اردو بیورو، نیو دہلی۔
4.ہندوستان کی اوّل اکیاون خواتین،ڈاکٹر بانو سرتاج،2010، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی۔

□□□

Shah Jahan Begum
H. No. 49/50A/87/ H8
Lakshmi Nagar
Kurnool-518002 (A.P)

سیدہ کفیل فاطمہ

انقلاب 1857 اور بیگم حضرت محل

مورخین کی رو سے ہندوستان میں 1857 کے سانحے کے بعد انگریزی حکومت کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ غدر تک ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت تھی، جو انگلینڈ میں صنعتی انقلاب کے بعد 1858 میں برطانوی پارلیمانی قوانین کے تحت کیبنٹ کے ہاتھوں میں آگئی۔ کیبنٹ یہ چاہتی تھی کہ:

> ''ہندوستان کی تجارت کمپنی کے ہاتھوں سے نکل کر عام ہو جائے اور یہ ملک اپنے مصنوعات کو باہر بھیجنے کے بجائے انگلستان کے مصنوعات کے لیے بازار بن جائے۔''

(1857 پس منظر پیش منظر از ڈاکٹر عبدالعلیم، ماہنامہ نیا دور، لکھنؤ شمارہ اپریل مئی 2007، انقلاب 1857 نمبر، ص۔10)

کمپنی کے سارے اختیارات فوراً حکومتِ برطانیہ کو منتقل ہونا غیر فطری اور دیر تک چلنے والا عمل تھا۔ اختیارات اور مقبوضہ مقامات کے حصار کے دوران ہندوستان میں بہت کچھ ہوا، بلکہ بہت کچھ برباد ہوا۔ نقل مکانی، بغاوت اور لاکھوں بے گناہوں کا خون۔ ریاستِ اودھ میں خونی انقلاب اسی عمل کے دوران ہوا۔ کیونکہ کمپنی کے جس پرانے معاہدے کے تحت اودھ میں بادشاہت قائم تھی، اودھ پر برطانوی حکومت کے لیے اسے کالعدم کرنا ضروری تھا اور اسی کالعدم نے اودھ میں بغاوت کی ابتدا کی۔

ہندوستان میں تحریک آزادی اور بغاوت کسی فوری ردِ عمل کا نتیجہ نہیں تھا۔ انگریزی حکومت اور ان کی زیادتیوں کی وجہ سے ہندوستان کا ہر طبقہ کسی نہ کسی طرح کی پریشانی میں مبتلا تھا۔ عوام میں غصہ و انتشار گھر کر چکا تھا۔ یہ انتشار مانندِ گرم سیال مادہ، لوگوں کے دلوں میں گردش کرتا ہوا انقلاب کی شکل میں پھوٹا۔ اس انقلاب کے پس منظر کا سرسری جائزہ لیا جائے تو جو اہم وجوہات خاص طور پر سامنے آتی ہیں ان میں کمپنی کے ذریعہ بادشاہ و نوابین کی مملکت پر غاصبانہ قبضہ، زمینداروں کی آراضی ملکیت پر قبضہ، کاشت کاروں پر حد سے زیادہ لگان، شہری کاریگروں کا برطانوی مصنوعات کی درآمد کے باعث فاقہ کشی کے لیے مجبور ہونا، ہندوستانی عوام کی قدیم معیشت کا تباہ ہونا اور انگریزوں کے ترقی پسند خیالات اور اعمال کے نتائج میں ہندوستان کے قدامت پسند عناصر کو چوٹ پہنچانا شامل تھا۔ چنانچہ ہندوستان کے ہر گوشے سے ہر طرح کے لوگ اس بغاوت میں پورے جوش اور ولولے کے ساتھ شامل ہوئے اور کمپنی کی بنیاد کو ہلا ڈالا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے خلاف اس پہلی جنگِ آزادی میں ہندوستانی عوام، راجہ، رانی، نواب، ٹھاکر، علما، برہمن، کسان، مزدور، باغی سپاہ، مفکرین

اور صحافی سبھی ایک جٹ ہوئے۔ مگر ان تمام آزادی کے پرستاروں کے ساتھ اگر ہندستان کی جاں باز خواتین کا تذکرہ نہ کیا جائے تو اِس انقلاب کا ذکر بے معنی سا لگتا ہے۔ ان عورتوں نے اپنی محل سراؤں و آرام گاہوں سے نکل کر، اپنے گھونگھٹ کو پرچم بنا کر، اپنی قائدانہ افکار، جوش و جذبہ اور ایثار و قربانی کی جو مثالیں پیش کی ہیں وہ ہندوستان کی نا قابلِ فراموش تاریخ کا حصہ ہیں۔ انھوں نے اپنی قوم اور ملک کے وقار کے ساتھ کبھی کوئی سمجھوتا نہیں کیا۔ مشکل سے مشکل حالات میں بھی کمپنی کی اطاعت سے نہ صرف انکار کیا بلکہ چٹان بن کر ان کی افواج کا سامنا کیا۔ ان مجاہدین آزادی میں جھانسی کی رانی، جھلکاری بائی، عزیزن بائی، اور بیگم حضرت محل وغیرہ کا نام بطورِ خاص قابلِ ذکر ہے۔

دہلی میں مغلوں کے کمزور پڑ جانے کے بعد انگریزوں نے ہندوستان کی تقریباً ہر ریاست کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنا شروع کیا۔ اُن دِنوں لکھنؤ خطۂ اودھ کا دارالسلطنت اور تجارت کا مرکز تھا۔ انگریزی افواج اور ریذیڈنٹ یہاں پہلے ہی سے تعینات تھے اور آہستہ آہستہ سارے نظام اور انتظام پر قابض ہو رہے تھے۔ طے شدہ حصار میں معاہدے کے تحت بادشاہت برقرار تھی۔ اس لیے کمپنی کے خلاف آواز اٹھانے کی جرأت کسی نواب نے نہ کی۔ محض شجاع الدولہ نے اپنی دلیری کا ثبوت دیتے ہوئے ان کے خلاف جنگ کا اعلان کیا اور لشکر کشائی کی مگر وہ اس جنگ میں ناکام رہے، نتیجتاً کمپنی کی سختی اور بڑھ گئی۔ شجاع الدولہ کے بعد اودھ کے تخت پر یکے بعد دیگرے سات بادشاہ بیٹھے مگر کسی میں انگریزوں کے خلاف جانے کی ہمت نہ ہوئی۔ انگریزوں کو یہ یقین ہو چلا تھا کہ اودھ اب اُن کی مٹھی میں ہے۔ مگر یہ یقین زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکا کیونکہ اسی درمیان محل سرا سے نکل کر شاہی دربار میں ایک ایسی دلیر خاتون نے دستک دی جس کی موجودگی نے سپاہِ اودھ میں نئی جان پھونک دی اور وہ ایک مرتبہ پھر اودھ کا کھویا ہوا وقار پانے کے لیے متحد ہوئے۔ اِس دلیر خاتون کا نام بیگم حضرت محل تھا جسے محمدی خانم، مہک پری، افتخار النساء، راج ماتا اور جنابِ عالیہ جیسے ناموں سے بھی جانا گیا۔

بیگم حضرت محل نوابوں کے سابق دارالسلطنت فیض آباد کے ایک عام کنبہ سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کا ابتدائی نام محمدی تھا جنھیں سلطان امجد علی شاہ کے بیٹے نواب واجد علی شاہ کی بیوی ہونے کا شرف حاصل تھا۔ واجد علی شاہ سے ان کی پہلی ملاقات، رقص و موسیقی کی درسگاہ میں ہوئی، جو شہزادے نے اپنے شوق کے سبب 1842 میں قائم کرایا تھا۔ درس گاہ کو پری خانہ اور سیکھنے والیوں کو پری کہا جاتا تھا۔ بلا کی خوبصورت حضرت محل پر فریفتہ شہزادے نے ان کا نام مہک پری رکھا اور شادی کر کے اپنی بیویوں میں شامل کیا۔ بیٹے رمضان علی مرزا، جسے بعد میں دادا امجد علی شاہ نے برجیس قدر کا خطاب دیا، کی پیدائش کے جشن کے موقع پر واجد علی شاہ نے ان کا نام افتخار النساء رکھا۔

بیگم حضرت محل کو اپنی جملہ خصوصیات اور بے پناہ صلاحیت کے سبب تمام بیگموں میں افضلیت حاصل تھی۔ سلطان امجد علی شاہ کے انتقال کے بعد واجد علی شاہ جب 13 رفروری 1847 میں تخت نشیں ہوئے تو انھوں نے افتخار النساء کو محمدی نگر و جلال آباد کی جاگیر دار بنایا اور ''حضرت محل'' کا خطاب عطا کیا۔ حضرت محل خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ حد درجہ ذہین بھی تھیں۔ وہ تاریخ سے دلچسپی رکھنے کے ساتھ فن شاعری میں بھی ماہر تھیں۔ ان کی شاعری کے نمونے آج بھی موجود ہیں۔ ان کی اس قدر عزت و احترام کی وجہ سے کئی بیگمات حسد کا شکار تھیں اور نواب سے اُن کی شکایت کا کوئی موقع نہیں چھوڑتیں۔ بیگموں کا یہ رویہ دورانِ انقلاب، انگریزوں اور دلال راجاؤں سے جنگ کے وقت بھی جاری رہا تھا۔ وہ واقعی عام بیگموں سے قدرِ مختلف مزاج رکھتی تھیں۔ ایک وفا شعار بیوی اور ذمہ دار ماں کی ساری خوبیاں ان میں موجود تھیں۔ برجیس قدر کی پرورش کے ساتھ ساتھ محل کی باہری دنیا اور اُتھل پتھل سے ہمیشہ واقف رہتیں۔ وہ کمپنی کی بدعنوانیوں اور حکومتِ اودھ کے خطرات سے باخبر تھیں۔

انگریز اودھ پر مکمل قبضے کا ناپاک ارادہ تو رکھتے ہی تھے۔ یہ ارادہ کچھ ہی دنوں بعد آشکار بھی ہونے لگا۔ نواب سعادت خاں کے زمانے سے ہی کمپنی کی افواج اودھ کی حفاظت کے بہانے یہاں پناہ گزیں تھے جنھیں ضروری اخراجات و سہولیات برابر مہیا کرائے جا رہے تھے۔ رفتہ رفتہ ان افوج کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہونے لگا۔ جب خرچ اٹھانا مشکل ہوا تو کمپنی نے اس کے بدلے روہیل کھنڈ اور دوآبا کو اپنے حصار میں لے لیا۔ باوجود اس کے انھوں نے واجد علی شاہ پر نا اہلی کے متعدد الزامات لگائے اور پرانے معاہدے کے برخلاف تخت شاہی سے سبکدوشی کا نیا فرمان جاری کر دیا۔ اس فرمان میں ایسی کئی نئی شرائط رقم کی گئی تھیں جس میں موجودہ اور آئندہ تاجداروں کی عزت و توقیر پر گہری چوٹ کی گئی تھی۔ واجد علی شاہ نے تمام الزامات کا معقول اور منطقی جواب دیا۔ لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ لہٰذا اپنے اہل کاروں، وفاداروں اور اہل خانہ سے مشورے کے بعد انھوں نے تخت پر رعایا کی زندگی کو ترجیح دی۔ واجد علی شاہ نے فرمان پر دستخط کیے بنا ہی برطانوی مقصد کو پورا کر دیا۔ اس طرح انھوں نے اپنی اور سلطنتِ اودھ کی غیرت کو معیوب ہونے سے بچالیا۔ اُس وقت انگریزوں کے مقصد یا منصوبے کا انکار کرنا جنگ کو دعوت دینا تھا جس میں قتل و غارت کا کھیل کھیلا جاتا اور ہزاروں بے گناہوں کا ناحق خون بہنا طے تھا۔ واجد علی شاہ کا ارادہ تھا کہ وہ اس ناانصافی اور غصب کے خلاف انگلینڈ جاتے اور ملکہ وکٹوریہ کے سامنے اِس ناانصافی کا مقدمہ پیش کرتے، مگر علالت کے سبب وہ نہ جاسکے، ان کے بدلے ان کی والدہ اور ایک بھائی وہاں گئے۔ معزول بادشاہ کے ساتھ یکے بعد دیگرے کئی ناانصافیاں ہوئیں اور آخر میں انھیں اُن کے چند مصاحبین اور سپاہیوں کے ہمراہ کلکتہ روانہ کر دیا گیا۔ محل سے جاتے وقت واجد علی شاہ کی اپنی بیگموں کو عام اجازت تھی کہ وہ محل چھوڑ کر جا سکتی ہیں۔ کئی نے اس پر عمل کیا تو کچھ وہیں رہ گئیں۔ بیگم حضرت محل نے ایسے حالات میں محل چھوڑنا وفاداری کے خلاف سمجھا اور منصوبہ بند طریقے سے رہنے لگیں۔

بادشاہ کی معزولی، ترکِ وطن اور کمپنی کے مظالم کے سبب پورا اودھ غم اور غصے میں مبتلا تھا۔ اِس غصے نے اودھ کے ساتھ پورے ہندوستان میں انقلاب کی شکل اختیار کر لی۔ ابتدا میرٹھ میں سپاہیوں کی بغاوت (چربی والے کارتوس کے انکار) سے ہوئی اور رفتہ رفتہ پورے ہندوستان میں پھیل گئی۔ راجہ مہاراجہ کے ساتھ ساتھ خواتین مجاہدینِ آزادی بھی اس میں شریک ہوئیں۔ ان میں جہاں ایک طرف رانی لکشمی بائی نے مورچہ سنبھالا، تو دوسری طرف بیگم حضرت محل نے جنگ کی قیادت شروع کی۔

لکھنؤ میں بغاوت کی شروعات 30 رمئی 1857 کو ہوئی۔ مولوی احمد اللہ شاہ اور نانا صاحب بھی اپنی فوج کے ساتھ میدان میں اتر آئے۔ بیگم حضرت محل بھی تمام حالات اور واقعات پر پینی نظر رکھے ہوئے تھیں۔ جائزے اور مشاہدے پر انھوں نے پایا کہ لکھنؤ میں باغیوں اور مختلف جگہ سے جمع ہوئے شاہی افواج میں کسی بڑی قیادت کی از حد ضرورت ہے۔ اس لیے کہ الگ الگ باغی گروہوں کے اپنے الگ الگ منصوبے اور من مانیاں تھیں۔ چنانچہ اپنی ذہانت کا ثبوت دیتے ہوئے انھوں نے ارادہ کیا کہ کم سن اور نابالغ برجیس قدر کو تخت پر بٹھایا جائے اور رعایا میں یہ منادی کرادی جائے کہ اودھ کی حکومت پھر سے لوٹ آئی ہے اور اب وہ انگریزوں کو اپنا حاکم نہیں مانتے۔ تاریخ نویسوں کا کہنا ہے کہ تاج پوشی اور بغاوت کے منصوبہ بندی میں حضرت محل کے خاص ڈیوڑھی داروغہ ممّو خاں نے سب سے فعال کردار ادا کیا تھا۔

برجیس قدر کی تخت پوشی کا یہ فیصلہ راج ماتا کے لیے جہاں کانٹوں بھرا تھا، وہیں اس فیصلے سے ان کی قائدانہ اور حاکمانہ صلاحیت کا پتا چلتا ہے۔ برجیس قدر محض 14 ربرس کے تھے اور قاعدے کے مطابق تخت کے اصل حقدار دوسرے بیٹے 'کیوان قدر' تھے، مگر وہ معزولی کے مقدمے کے لیے اپنے چاچا اور دادی کے ساتھ لندن میں تھے۔ تیسرے بیٹے 'فریدوں قدر' والد کے ہمراہ مٹیا برج کلکتہ میں تھے۔ اس لیے تخت نشینی سے قبل انھوں نے آس پاس کے زمینداروں، نوابوں، راجاؤں، مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر اور سب سے فعال مجاہد آزادی مولوی احمد اللہ شاہ سے مشورہ کیا اور اجازت چاہی۔ اتنا ہی نہیں محل کی دوسری بیگمات کو بھی دعوت دی کہ وہ اپنے خواہش مند فرزندوں کو تاجداری کے لیے سامنے لائے، مگر یہ حضرت محل کا وقار تھا کہ کسی نے دست اندازی نہ کی۔ لکھنؤ کی فوج کمیٹیوں کے کچھ ضمنی شرائط تھے جس کا بیگم نے خاص لحاظ رکھا۔ کچھ افراد کی ناراضگیاں بھی تھیں۔ ظاہر ہے اس طرح کے فیصلے سے ہر کسی کو مطمئن نہیں کیا جا سکتا، مگر کچھ بیگموں، کچھ درباریوں اور کچھ خاص لواحقین کو چھوڑ کر اودھ کی ساری عوام عام طور پر اس تاج پوشی سے خوش تھی۔ اس طرح بیگم حضرت محل کی حکمتِ عملی نے منتشر خیالات اور مختلف اذہان والے انقلابی افواج کو نہ صرف متحد کرنے کا کام کیا بلکہ انھیں تنگ نظری سے بھی باہر نکالا۔ بجا طور پر بیگم کا یہ طریقہ کسی قوم کی جمہوری طرز نظام سے بالکل قریب تھا۔

اودھ میں جس طرح کے حالات تھے اُس میں کسی بادشاہ کو حکمرانی کے لیے سامنے لانا کمپنی سے سیدھی بغاوت مول لینے کے برابر تھا، ساتھ ہی یہ بھی خدشہ تھا کہ کہیں اِس فیصلے سے نواب واجد علی شاہ انگریزوں کے

تشدد کا شکار نہ ہو جائیں۔ حضرت محل کو اس وجہ سے کئی بیگموں کے طعنے بھی سننے پڑے۔ لیکن وقت کا تقاضہ یہی تھا کہ نابالغ برجیس قدر کی تاج پوشی کی جائے، جس کی اصل قیادت بیگم حضرت محل کے پاس رہنی تھی۔ چنانچہ نگینے (چاندنی) والی بارہ دری میں جولائی/1857 کو تمام حاضرین کے سامنے بڑی دھوم دھام سے برجیس کی تاج پوشی کی گئی۔ شکیل صدیقی کے مطابق:

''سیکڑوں افراد کا بارہ دری کے اندر داخل ہو جانا پھر نئے بادشاہ کا نیاز حاصل کرنے کا اصرار کرنا۔ اودھ کے مختلف راجاؤں کے ذریعہ بادشاہ کی حمایت میں یکجا ہونا اور انگریز مخالف جنگ میں ہر طرح کی مدد کے لئے رضامندی ظاہر کرنا بھی جائز وارث کی حیثیت ان کی منظوری کے جذبہ کی عکاسی کرتا ہے۔...بیگم نے خود یا اپنے فرزند کے سکون کے لئے اس عظیم جنگ اور ان پر اعتماد و بھروسہ کرنے والی اودھ کی رعایا کے ساتھ ایک لمحہ بھی دغابازی نہیں کی۔ انقلاب کے لئے ان سے اسی جذبۂ وابستگی اور عزم وارداوں کی پختگی نے ہی پورے اودھ میں ایسا جوش وولولہ نیز بیداری پیدا کردی کہ لاکھوں لاکھ افراد ان کے ایک اشارے پر قربان ہوجانے پر تیار ہوگئے۔''

(بیگم حضرت محل از شکیل صدیقی، ماہنامہ نیادور، لکھنؤ، شمارہ اپریل مئی 2007، انقلاب 1857 نمبر، ص۔61)

برجیس قدر کی تاج پوشی کے ساتھ ہی حضرت محل کی ذمہ داری بھی اب دوگنی ہوگئی۔ محل سرا میں رہنے والی بیگم اب دربار میں بڑے بڑے عہدے داروں، زمینداروں اور جاں باز سپاہیوں سے رو برو تھیں۔ مشوراتی نشستوں میں پردے کے پیچھے سے بڑے جوشیلے انداز میں خطاب کرتی ہیں۔ ان کی عالمانہ اور حوصلہ آمیز گفتار کے سبھی قائل ہیں۔ حضرت محل کا عزم اور حوصلہ کسی مشاق جنگ جوں سے کم نہ تھا۔ شہزادے کی طرف سے آزاد ریاست کی منادی کرائی گئی اور انگریزوں کے ذریعہ شاہی فوج سے برخاست سبھی پرانے سپاہیوں کو واپس بلایا گیا۔ برخاست کوتوال کو دوبارہ شہر کا کوتوال مقرر کیا گیا۔ بغاوت کی شروعات ہوگئی۔ سب سے پہلے بیلی گارد کی عمارت جو انگریز ریذیڈنٹ کی رہائش گاہ تھی، کا گھیراؤ کیا گیا۔ حضرت محل ہر جنگ میں سپاہیوں کے ساتھ رہتیں اور جوشیلی تقریروں سے اُن کا حوصلہ بڑھاتیں۔ یہاں ایک بیگم کا خط ملاحظہ ہو جو واجد علی شاہ کو لکھا گیا ہے جس سے بیگم حضرت کی بہادری کا پتا چلتا ہے:

''حضرت محل نے ایسی بہادری دکھائی کہ دشمن کے منہ پھر گئے۔ بڑی جی دار عورت نکلیں۔ سلطان عالم کا نام کردیا کہ جس کی عورت ایسی ہو جو مردانہ وار مقابلہ کرسکتی ہو تو اس کا مرد کیسا بہادر اور شجاع ہوگا۔''

(بیگم حضرت محل از نیر مسعود، ماہنامہ نیادور، لکھنؤ، شمارہ اپریل مئی 2007، انقلاب 1857 نمبر، ص۔52)

ادھر دہلی کا حال بھی کچھ ٹھیک نہیں تھا۔ وہاں مغلوں اور باغی سپاہیوں کی شکست ہو چکی تھی۔ بچے ہوئے باغی سپاہی اور شاہی افراد اودھ میں پناہ کا ارادہ کر رہے تھے۔ کانپور میں بھی انگریز حاوی ہو چکے تھے۔ حضرت محل جو قیصر باغ میں باقی بیگموں اور سپاہیوں کے ساتھ مقیم تھیں، کو خبر پہنچائی کہ کانپور سے باغی لکھنؤ کی طرف آرہے ہیں ساتھ ہی انگریزی فوج بھی ان کے تعاقب میں اِدھر چلی آرہی ہے۔ بیلی گارد میں جہاں بیگم حضرت محل نے پہلا حملہ کیا تھا، خوب گولیاں چلیں مگر قبضہ ابھی نہ ہو پایا تھا۔ مختلف افواہوں کے بیچ انگریزی فوج بیلی گارد تک پہنچ گئی اور بعد میں قیصر باغ کی طرف بڑھی۔ بیگم نے قیصر باغ کے سارے گیٹ بند کروادیے۔ دوسری طرف سے ہندوستانی فوج بھی آپہنچی اور قیصر باغ میں زبردست خونی جنگ ہوئی۔ قیصر باغ میں ہزاروں کی تعداد میں لوگ مارے گئے۔ حضرت محل اپنے ساتھ کئی عورتوں کو لے کر قیصر باغ سے نکلنے پر مجبور ہوئیں اور حسین آباد میں پناہ لی۔ یہاں ایک بار پھر وہ اپنے اہل کاروں کے ساتھ جنگ کی ترا کیبوں میں مشغول ہوئیں اور کچھ ہی دنوں بعد انگریزوں پر حملہ آور ہوئیں، مگر ناکامی پھر ہاتھ لگی۔ جنگ میں ضروری وسائل کی کمی نے انھیں بار بار مایوس کیا۔

بیگم حضرت محل نے لگاتار ناکامیوں کے باوجود کبھی ہار نہیں مانی اور نہ ہی اُن کا حوصلہ پست ہوا۔ انگریزی حکام کی جانب سے انھیں جنگ کو ختم کرنے اور شکست قبول کرنے کے کئی فرامین بھیجے گئے جس کے بدلے میں ملنے والی کئی پیش کش کو وہ ٹھکرا چکی تھیں۔ وہ ایک خوددار اور باوقار شخصیت کی مالک تھیں۔ اپنے ہی مملکت کو انگیریزوں کے ذریعے کسی پھینکے ہوئے ٹکڑے کی طرح پانا انھیں قطعی منظور نہ تھا بلکہ وہ اسے اپنے بازوؤں کے دم پر اور باعزت طریقے سے پانا چاہتی تھیں۔ دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ انگریزوں کے قول کا کوئی بھروسہ نہیں وہ کسی بھی وقت دغا کرنے میں ماہر تھے۔ ساتھ ہی اِس رسوائی کو قبول کرنے سے مختلف مقامات پر انگریزوں سے مورچہ لے رہے دوسرے افواج کے حوصلے بھی پست ہوجاتے۔ وہ اودھ کی عظمت وتوقیر کی بازیابی لیے جنگ میں اتری تھیں۔ انھیں ناکامی کا رنج تھا، مگر خوف نہیں! اور نہ ہی اس خوف کے بدلے انگریزوں کی کسی طرح کی رعایت کو قبول کرنا چاہتی تھیں۔ یہ رعایت ان کے نزدیک کسی

ذلالت سے کم نہ تھی جس کے بدلے انھوں نے ملک ترک کردینا گوارا سمجھا تھا۔ کافی جدوجہد کے بعد آخر کار حضرت محل نے مارچ 1808/ میں لکھنؤ کو خیر آباد کہا اور نیپال کا رخ کیا۔ خیر خواہوں نے انھیں باحفاظت نیپال پہنچانے کا بھروسہ دلایا۔ راستے میں بہرائچ کے قریب بونڈی میں حضرت محل نے پڑاؤ ڈالا۔ لکھنؤ کی شکست خوردہ افواج جو اِدھر اُدھر بکھر چکی تھی، آہستہ آہستہ بونڈی میں جمع ہونا شروع ہوئی۔ اسی دوران برطانیہ سے کئی اچھے وعدوں کا پیغام ہندوستان پہنچا۔ فرمان سن کر کئی افراد واپس بھی ہوئے۔ مگر بیگم حضرت محل نے اس فرمان کی تردید کرتے ہوئے ہر مجسٹی (ملکہ وکٹوریہ) کے سامنے اودھ پر انگریزوں کے غاصبانہ قبضے کو یاد دلایا۔ نیر مسعود کے مطابق:

''حضرت محل نے اس فرمان میں ایک سوال بھی کیا تھا کہ انگریزوں نے اس بہانے سے کہ ہمارا انتظام اچھا نہیں تھا اور ہماری رعایا ہم سے خوش نہیں تھی، ہمارے ہاتھوں سے ہماری حکومت لے لی۔ اگر ایسا تھا تو رعایا نے اتنی وفاداری سے ہمارا ساتھ کیوں دیا اور ہماری خاطر اپنی جانیں کیوں قربان کیں؟ یہ سوال تھا جس کا آج تک جواب نہیں مل سکا''۔

(بیگم حضرت محل از نیر مسعود، ماہنامہ نیا دور، لکھنؤ، شمارہ اپریل مئی 2007، انقلاب 1857 نمبر، ص۔54)

اس بیان کے ساتھ ہی بیگم حضرت محل نے بونڈی سے عوام کو خطاب کرتے ہوئے ناگری اور فارسی رسم الخط میں کئی تحریر جاری کیں کہ وہ ملکہ وکٹوریہ کے سنہرے خوابوں کے جھانسے میں نہ آئیں اور اپنی لڑائی جاری رکھیں۔ بونڈی میں ایک مرتبہ پھر حضرت محل کی فوجوں نے انگریزوں سے لوہا لیا۔ مگر انگریز کی کثیر فوج کے آگے ٹک نہ سکے۔ اس مرتبہ وہ بالکل ٹوٹ گئیں اور چار و ناچار اپنے کچھ ساتھیوں اور بیٹے برجیس قدر کے ساتھ نیپال روانہ ہوئیں۔ اِدھر اودھ میں انگریز کامل طور پر حکومت کرنے لگے۔

کچھ دنوں بعد ایک سفیر حضرت محل کے ہاں پہنچا اور پیغام دیا کہ وہ ہندوستان میں آکر شاہی عیش و آرام سے رہیں اور مطابق شان وظیفہ پائیں، مگر انھوں نے یہ پیش کش ٹھکرادی۔ کسی ملک کی راج ماتا اور ملکہ کا اعجاز یہ ہوتا ہے کہ وہ اس کی بقا اور عزت کے لیے سب کچھ داؤں پر لگا دے، جیسا کہ حضرت محل نے کیا۔ روایتاً شاہی خاندان کا فرد نہ ہوتے ہوئے بھی وہ رعایا کی بقا، سلامتی اور کھوئی ہوئی عظمت کے لیے امیرِ لشکر بنی اور جنگ کے میدان میں آ گئیں۔ بہت کچھ کھویا، لیکن اپنی ذمہ داری اور وفاداری سے کبھی منہ نہ موڑا۔ کیا ہوا گر کامیابی نہ ملی، مگر دشمن کے زیرِ سایہ رہنا انھیں ہرگز گوارا نہیں ہوا۔ انھیں ہندستان سے اب بھی انتاہی پیار تھا مگر انگریزوں کی اطاعت منظور نہیں تھی۔ انھوں نے خود کو ذلت سے بچا کر اودھ کو ذلیل ہونے سے بچایا۔ 7/ اپریل 1859 کو نیپال میں ہی ان کا انتقال ہوا، اور وہیں جامع مسجد کے صحن میں ان کی تدفین ہوئی۔

ولیم رسل کے مطابق بیگم اپنے شوہر سے زیادہ بہادر تھیں۔ حضرت محل کے لیے یہ خیالات اکثر محققین اور مورخین کے یہاں مشترک ہیں۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ قیادت اور حکومت لیے ایک بادشاہ کے اندر ایمانداری، وفاداری، نظریہ اشتراکیت، حکمت عملی، اعلیٰ ظرفی، آئین لشکری اور وسیع النظری جیسے خصائص کا ہونا لازمی ہے، وہ تمام خصائص بیگم حضرت محل میں موجود تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں سب کا ساتھ ملا۔ اودھ میں جب انقلاب کی باقاعدہ شروعات ہوئی تو قیادت ان کے ہاتھ میں تھی۔ ایک اعلان پر ہندو رجواڑوں کا ساتھ دینا اور رعایا کے ہر چھوٹے بڑے طبقے، ہر ملت و مذہب کے لوگوں کا بڑی تعداد میں حمایت اور شمولیت حاصل کرنا بڑی بات تھی۔ تاہم بیگم حضرت محل کا سبھی کے حقوق کو سمجھتے ہوئے اتحاد قائم کرنا ان کی شخصیت کی بڑی کامیابی تھی۔ وہ خود ہاتھی پر سوار ہو کر عالم باغ اور دوسرے مورچہ پر جاتیں۔ کئی بڑے زمیندار اور رجواڑے ایسے تھے جو انگریزوں کے مظالم سہہ کر اندر ہی اندر سلگ رہے تھے۔ جب ایک مضبوط قیادت سامنے آئی تو گویا جیسے وہ اسی کے منتظر تھے، بغیر کسی شرط کے بیگم کے ساتھ کھڑے ہوگئے۔ اودھ کا بڑا کارنامہ یہ بھی تھا کہ جس ہڈسن نے دہلی میں بہادر شاہ ظفر کو گرفتار کیا اور ان کے شہزادوں کو دہلی گیٹ کے سامنے بھرے مجمع میں گولی مار کر سر کو جسم سے الگ کر دیا تھا، کو مارچ 1858/ حضرت گنج میں بیگم کے جاں باز سپاہیوں نے دھول چٹادی۔ حضرت محل نے ہڈسن کو شہزادوں کا قاتل قرار دیتے ہوئے سزائے موت کا اعلان کیا تھا۔

حضرت محل اخلاقی اور سماجی طور پر بھی ایک بہترین خاتون واقع ہوئی ہیں۔ پرتشدد بغاوت کے دوران بندی بنائے گئے انگریز خواتین اور بچوں کو کسی بھی طرح کی اذیت سے بچائے رکھنا ان کے حسن سلوک اور اعلیٰ ظرفی کو ثابت کرتا ہے۔ جنگ کے دنوں میں اور جنگ کے بعد بھی ان کے اخوت و محبت اور دریادلی کی کئی مثالیں دیکھنے کو ملتی رہیں:

''جنگ کے دنوں میں دہلی کی سلطنت بہادر شاہ ظفر کے مددگاروں اور وہاں کی فوج کمیٹی کو پوری عزت بخشی۔ یہ اتفاق نہیں تھا کہ دہلی کی شکست کے بعد لکھنؤ اور اس کے قریب میں چل رہی آخری جنگ ہی مغل شہزادوں، جنرل بخت خاں اور وہاں سے آئے ہزاروں فوجیوں کی مورچہ بندیوں نے

بیگم اور ان کے معاونین کو شرمناک شکست سے بچالیا تھا۔ اس رشتہ کو بیگم نے نیپال میں ہی پناہ لئے مغل شہزادے مرزا داؤد بیگ کی دختر مختار النساء سے اپنے فرزند برجیس قدر کا نکاح کرا کے اس رشتہ میں نئی روح پھونک دی‘‘

(بیگم حضرت محل از شکیل صدیقی، ماہنامہ نیا دور، لکھنؤ، شمارہ اپریل مئی 2007، انقلاب 1857 نمبر، ص۔65)

دراصل بیگم حضرت محل نے اودھ کی کھوئی ہوئی عظمت و عزت کے لیے جس طرح کی جدوجہد کی، معرکہ آرائی کی اور کسی بھی حرص وطمع کے سامنے اپنی غیرت اور ایمانداری کا دامن ہاتھ سے جانے نہ دیا اور ہر لمحہ اپنی رعایا کی آزادی کے لیے فکرمند رہیں، یہ فکرمندی محض اودھ کے لیے نہیں تھی بلکہ پورے ہندوستان کے لیے تھی۔ میرے خیال میں 1857 کی تحریکِ آزادی کو ناکام کہنا بالکل درست نہیں ہے۔ اگر 1857 نہ ہوتا تو ہم آج بھی انگریزوں کی غلامی کر رہے ہوتے۔ 1857 کی جدوجہدِ آزادی تاہم بیگم حضرت محل اور جھانسی کی رانی جیسی خواتین کی قربانیاں ہندوستان کی عوام اور تمام آزادی کے متوالوں کے لیے حوصلے کا کام کرتی رہی۔ یہ حوصلہ سن 47 تک قائم رہا اور اسی حوصلے کی بدولت ہمارا ملک انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہوا۔ وطن سے محبت کا جو پیغام انھوں نے دیا تھا وہ لوگوں کے دلوں میں آزادی کے وقت بھی باقی رہا اور آج بھی باقی ہے۔ حضرت محل کی بڑی کامیابی یہ بھی ہے کہ انھوں نے خواتین کے اذہان کو بیدار کرنے کا کام کیا۔ ہندوستان میں آج خواتین کو ہر میدان میں پیش پیش رہنے کا اگر شرف حاصل ہے تو وہ بیگم حضرت محل جیسی خواتین کی ہی دین ہے۔

□□□

Sayyada Kafeel Fatma
Research Scholar, Dept. of Urdu
Banaras Hindu University
Ajagara, Varanasi-221005(U.P)

Subscription Form "Mahnama Khwateen Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں ’ماہنامہ خواتین دنیا‘ کا/کی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر.................................. بتاریخ.................................

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/100 روپے IFSC: SYNB0009009، A/C: 90092010045326 میں جمع کروادیا ہے۔

آپ ’ماہنامہ خواتین دنیا‘ ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.:sales@ncpul.in

دستخط

ڈاکٹر عبدالحفیظ

میرا کانت کے
ڈراموں کا تجزیاتی مطالعہ

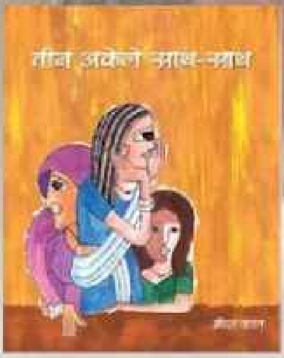

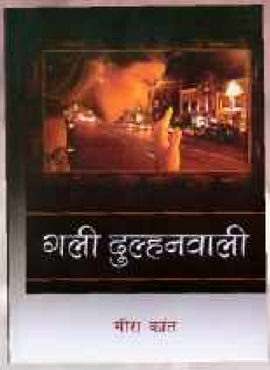

ہندوستانی ادب کی تاریخ میں ڈرامے کو اوّلیت و مرکزیت حاصل رہی ہے اور اس کا ایک سنہری دور رہا ہے۔ بھرت منی کے ''ناٹیہ شاستر'' کو ڈرامائی ادب کا اوّلین نمونہ ماننے پر سبھی کو اتفاق ہے، اس کے بعد ہندی ڈراموں کی ایک طویل درخشاں تاریخ رہی ہے مگر مرورِ زمانہ کے ساتھ اس کی جاذبیت میں کمی آئی اور ہندی کے ادباء و شعراء دوسری اصناف کی طرف مائل ہونے لگے۔ پچھلے پچاس سالوں میں ہندی میں دوسری اصناف کے مقابلے میں ڈرامے بہت کم لکھے گئے اور اسٹیج کیے جانے والے ڈراموں کی تعداد اس سے بھی کم ہے۔ لیکن یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ ہندی ادب میں ڈرامہ روبہ زوال ہے اور اپنی آخری سانس لے رہا ہے کیونکہ وقفے، وقفے سے کچھ اچھے اور قابلِ قدر ڈرامے سامنے آتے رہے اور اسٹیج بھی کیے گئے۔ پچھلے پچیس تیس سالوں کی ہندی ادب کی تاریخ میں ڈرامہ نویسی کے لیے جو چند نام ابھر کر سامنے آئے یا جن کو انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے یا یوں کہا جائے کہ موجودہ نسل میں ہندی ڈرامہ نویسی کی مختصر ترین فہرست بھی ترتیب دی جائے تو اس میں میرا کانت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے کہانیوں اور ناولوں کے ساتھ ساتھ کئی اہم اور دلچسپ ڈرامے بھی لکھے۔ ان کی اپنی ہی کہانیوں پر منحصر تین ڈراموں کا مجموعہ ''تین اکیلے ساتھ ساتھ'' بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس مجموعے کی تمہید میں بھومیکا کی جگہ کایانتر (روح کا دوسرے انسانی جسم میں منتقل ہونا) کا لفظ استعمال کیا ہے جو بہت ہی معنی خیز ہے، خود لکھتی ہیں ''میرے لیے یہ میری کہانیوں کا نیا اوتار ہے جیسے کوئی بنا مرتیو (موت) کو پراپت (حاصل) کیے ہوئے ہی وستر (لباس) بدل کر دوبارہ جنم لے لے'' یہ بڑے ہی مختلف طرح کے ڈرامے ہیں اور کہانی کے لحاظ سے ان میں عورت کو مرکزیت حاصل ہے۔ تینوں ڈرامے عورت کے درد کو سمجھتے ہوئے ان کی مزاحمت کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں اور مرد غالب سماج کے تصوّر کی تردید کرتے ہیں۔

اگر ماہر فنکاروں کے ذریعہ ان کو اسٹیج کیا جائے تو یقیناً بہت موثر ثابت ہوں گے، مجھے یقین ہے کہ اگر یہ ڈرامے اسٹیج کیے جائیں تو ناظرین کو سحر زدہ کر دیں گے۔ میرا کانت کے ڈرامے صرف عورتوں کے مسائل کو ہی اجاگر نہیں کرتے بلکہ یہ ہمارے فرسودہ روایتی تہذیب و ثقافت کے کمزور پہلوؤں کی تنقید بھی کرتے ہیں اور ساتھ ساتھ آپسی محبت و بھائی

چارہ کی توضیح وتوصیف بھی کرتے ہیں۔ ''گلی دولہن والی''، ''دھامپور'' اور ''کاغذی برج'' کے پلاٹ اور کردار بھلے ہی آپس میں مختلف ہوں مگر ان کے درمیان دکھ کی ندی ضرور بہتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ اس مجموعے میں شامل میرا کانت کا پہلا ڈراما ''گلی دولہن والی'' کا جائے وقوع قصائیوں کا محلّہ ہے۔ کہانی کا بیشتر حصّہ قصائی خاندان اور جزوی طور پر ''گوری'' کے خاندان سے وابستہ ہے جسے نچلے درجے کے مسلم خاندان اور متوسط درجے کے ہندو پریوار کی نمائندگی کے طور پر بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ بظاہر دونوں کی الگ الگ دنیا ہے مگر ڈرامہ نویس کو اچھی طرح معلوم ہے کہ جو بظاہر الگ الگ دکھائی دیتے ہیں ضروری نہیں کہ وہ اندر سے بھی اتنے ہی مختلف ہوں۔ ان ڈراموں میں ظاہری طور پر سب کی الگ الگ دنیا ہے مگر پدرانہ نظام کی بے رحمی سب میں موجود ہے۔ عورتوں پر کیے جا رہے ظلم وستم کی نوعیت کچھ بھی ہو مگر موجود، دونوں فرقے میں ہے۔ ڈرامہ نویس قصائیوں کے محلے کے دو مختلف خاندانوں کی سچائی دکھانے میں کامیاب ہے۔ ''کوئی جھٹکے سے اتار دیتا ہے تو کوئی روزانہ ذبح کرتا ہے۔ بے رحمی ہی پدرانہ نظام کی صفتِ خاصّہ ہے اور شفقت ومحبت اس کا نقص''۔ ''دھام پور'' اور ''کاغذی برج'' میں میرا کانت نے اسی بنیادی تصوّر کے استحکام کی بھرپور کوشش کی ہے ''گلی دولھن والی'' میں قصائی خاندان کی عورت نگینہ اور گوری کی ماں کے ذریعہ میرا کانت نے بڑے موثر انداز میں یہ بتایا ہے کہ اکثر، درد، ذات اور مذہب کے بندھنوں سے تجاوز کر جاتا ہے اور انسانی محبت کا اظہار کرتا ہے جو عورتوں سے متعلق محدود سوچ کی ملامت کرتا ہے۔ ممکن ہے نگینہ اور گوری کی ماں سے تنّیا اور گوپا کی کبھی ملاقات نہ ہوئی ہو مگر ان کی زندگیاں ایک دوسرے سے مماثل ہو کر ہندوستانی عورت کا استعارہ ضرور بن جاتی ہیں۔ ان پڑھ نگینہ سالوں سے پٹتے پٹتے تنگ آ کر ایک دن مزاحمت کر بیٹھتی ہے اور اپنے شوہر کے ظلم وستم کی عادی، فاتحانہ انداز میں برابر جواب دینے لگتی ہے اور اپنے حقوق کو اچھی طرح سے جان لیتی ہے۔ تنّیا اور گوپا تعلیم یافتہ ہیں اور ان کی زندگی کی ناخوشگواریوں کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ ناخوشگواریاں ان کا اپنا انتخاب ہیں اور ان کو یہ نعمت کے طور پر ملی تھیں۔ اب وہ نمائشی زندگی سے نکلنا چاہتی ہیں مگر نکل نہیں پا رہی ہیں۔ تنّیا کو بار بار اس کی پھوپھی پربھا کی طرح دھام پور کی بس میں بٹھا دیا جاتا ہے یہ جاننے کی کوشش بھی نہیں کی جاتی کہ اب تنّیا یا پربھا کی منزل دھام پور ہے بھی یا نہیں۔ ڈرامے میں دھام پور کو عورتوں پر ظلم وستم کے استعارے کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ موجودہ سماج کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو عورت کی زندگی میں کوئی نہ کوئی دھامپور ضرور ہے کہیں مخفی ہے تو کہیں نمایاں۔ درد بہت معصوم وشفاف ہوتا ہے، برداشت کی دبیز چادر سے بھی اس کی ملمع سازی نہیں کی جاسکتی۔ کبھی آنکھوں سے تو کبھی باتوں سے چھلک ہی جاتا ہے صدیوں سے ہوتے آرہے عورتوں پر ظلم وستم، پدرانہ نظام کو دکھائی نہیں دیتا۔

اس مجموعے میں شامل میرا کانت کے ڈرامے اپنے ظاہری اور باطنی دونوں طور پر پدرانہ نظام کے نقائص پر چوٹ کرتے ہیں۔ یہ ڈرامے صرف عورتوں کے درد کو ہی نہیں بیان کرتے بلکہ ان تمام وسائل اور اسباب کو بھی بے نقاب کرتے ہیں جو عورتوں پر ایذا رسائی اور دل آزاری میں معاون ومددگار ثابت ہوتے ہیں ساتھ ہی عورت کی ممتا، محبت اور خودسپردگی کو صحیح معنوں میں سمجھنے اور اس کی توقیر وتعظیم کی تلقین بھی کرتے ہیں۔ ''کاغذی برج'' میں ماضی اور حال کا گہرا ربط ہے اس میں جہاں ایک طرف بھاگمتی، تارامتی اور قلی قطب شاہ کی پہلی بیوی کے ذریعے عورت کی ہمت وحوصلہ کا بیان ہے تو وہیں دوسری طرف گوپا جیسی تعلیم یافتہ عورت کی قوت وبے باکی کی تصویرکشی بھی ہے۔ گوپا کسی پر منحصر نہیں، خود کفیل ہے لیکن ایک مرد کی جھوٹی محبت کے فریب نے اسے اس قدر اکیلا وتنہا کر دیا کہ زندگی جینے کی تمنا اور آس بھی نہیں رہی۔ یہاں یہ سوال بھی کیا جاسکتا ہے کہ کسی عورت کا فریب بھی کسی مرد کو ان حالات سے دوچار کرسکتا ہے مگر ایسا کم ہوتا ہے کیونکہ پریم چھل عورتوں کی خصلت نہیں۔ 'کاغذی برج' کا خاتمہ بھی 'گلی دولھن والی' کی طرح معنی خیز ہے اس میں کٹے ہوئے کینچوے کا استعارہ بھی بہت موثر ہے۔ ڈرامے کے کچھ مکالمے بطورِ مثال پیش کیے جا رہے ہیں تاکہ ان ڈراموں کی حقیقی قدر وقیمت کا تعین ہوسکے۔

''اس دن پندرہ برس بعد آواز سنی میں نے گوری اور اس کی ماں کی۔۔۔۔ پندرہ برس بعد۔ کیسا عجیب ہے یہ نگوڑا دل بھی۔ سینے میں پڑا دھڑکتا رہتا ہے اور جب کسی سے رشتہ بنا لیتا ہے تو جانے اس کے لیے غم کے ساتھ خوشی میں بھی کیوں روتا ہے۔

باولہ! گوری کی ماں بھی تو کیسا لہک لہک کر بات کر رہی تھی اور آج تو گوری ملنے بھی آرہی ہے۔ تو بات تو دل کی ہوئی نا۔۔۔ ورنہ ان کا میرا کیا میل! گوری کی ماں ٹھہری پکّی ہندوانی۔۔۔۔۔ افسر کی بیوی اور میں مسلمان۔۔۔۔ قصائی کی بیوی! پر کچھ بھی کہہ لو عورت کا دل تو عورت ہی جانتی سمجھتی ہے۔ اپنے سارے دکھ درد میں گوری کی ماں کو ہی بتاتی تھی۔ کیا زمانہ تھا وہ بھی! (صفحہ 16)

ماں بتاتی تھی ایک برس رائے بریلی میں پانی برسا۔ اتنا برسا کہ سارے گاؤں میں باڑھ آ گئی۔ سب تہس نہس ہو گیا۔ جمع بٹورا بہہ رہا

تھا۔ گیہوں اور دھان کی فصل ماری گئی۔ دور دور تک اناج نہیں۔ بھوکمری کا ماحول تھا۔ تبھی خبر ملی کہ کہیں دور ایک قصبے میں سرکار مصیبت زدہ گاؤں والوں کو راشن دے گی۔ گھر کے سب لوگ، پردے والی عورتیں بھی، بچّے بھی، سب کنستر، ڈولچے اور برتن اُٹھا اُٹھا کر چل دیے دادا میاں کے پیچھے پیچھے۔ پر وہاں نفری کے حساب سے ایک خاص مقدار میں ہی اناج ملا۔ سو خالی کنستر لے کر لوٹ آئے۔ امی کے دادا میاں نے اعلان کیا کہ گیہوں کی روٹی اور چاول صرف گھر کے مرد اور لڑکے کھائیں گے۔ عورتیں ان کی تھال میں بچے ٹکڑے کھائیں گی اور چاول کا ماڑ پیے گی۔ گھر کی بچیوں کو کیا دیا جاتا تھا۔ چنے اور مہوا کے پھولوں کو بھون کر بنا چبینا۔ (افسردگی میں)

ماں نے بتایا تھا کہ اگر کبھی غلطی سے کسی بھائی کی روٹیاں بچ جاتیں یا وہ کہیں گیا ہوتا تو اس کے انتظار میں روٹیاں چھت کی کڑیوں سے لٹکے جھینکے میں رکھ دی جاتیں کہ کہیں لڑکیاں نہ کھا جائیں (طنزیہ انداز میں) لڑکیاں تو بھوکے پیٹ کام کرنے کے لیے تھیں۔ پھر جو چبینا ملتا اسے دھیرے دھیرے چبا چبا کر منھ میں جمع لار کے ساتھ نگلتی تھیں غریب! (صفحہ 27)

جیٹھانیاں اور نندیں یا تو رسوئی میں ہوتیں یا نیند کی آغوش میں۔ آج اس کی بُرائی تو کل اُس کی برائی۔ رادھے شیام دوستوں کی منڈلی میں خوش تھے۔ اب ایک ہی آس تھی۔ بچّے ہی انھیں دھامپور کی کھونٹی سے باندھ سکتے تھے۔ اس میں دیر پر دیر ہوئی جا رہی تھی۔ رادھے شیام بابو نے دلّی لا کر ان کی جانچ کروائی۔ ایک نہیں کئی جگہوں پر۔ جیسے ہی ڈاکٹروں نے یہ اشارہ دیا کہ کمی پتنی میں نہیں پتی میں ہے تو رادھے شیام بابو بیچ راستے سے تتکال لاپتہ ہو کر واپس دھامپور پہونچے۔ پھر نہ کبھی اپنی سسرال میں دیکھے گئے نہ دلّی میں۔ اور اب تو انھوں نے اپنی پتنی سے بھی کٹی کاٹنی شروع کر دی۔ (تھک کر چارپائی پر بیٹھ جاتی ہے۔ پھر طنز کے ساتھ مونچھوں پر بل دیتے ہوئے بات آگے بڑھاتی ہے)

اس دن کے بعد سے رادھے شیام بابو کچھ زیادہ گھنی مونچھیں رکھنے لگے۔ اپنی مردانگی دکھانے کے لیے اب ان کی شامیں آدھی آدھی رات تک باہر ہی بیتتی تھیں۔ ان کا رستا ٹوٹ چکا تھا پر گھر میں کہا یہی جاتا رہا کہ خرابی کھونٹے میں ہے جو انھیں باندھ نہیں پا رہا! اس بیچ ایک دن گھر میں چوری ہوئی اور پربھا بوّا کی صندوقچی سے سارے زیور غائب ہو گئے۔ صرف اور صرف بوّا کی صندوقچی ہی کھلی پائی گئی تھی۔ (صفحہ 57)

شرلی۔۔۔ شرلی پھر اسپتال پہونچ گئی۔ اس کی دماغی حالت اسے چین سے جینے نہیں دے رہی ہے۔ مگر کیوں؟ ماما میں قصبے میں پلی بڑھی تھی۔ نکھل کے شبدوں میں 'میرٹھ مینٹلٹی' کی ہوں پر شرلی؟ شرلی تو بچپن سے ہی بورڈنگ میں رہی ہے۔۔۔ پڑھی ہے۔۔۔ میو کالج سے آئی تھی وہ۔۔ پھر۔۔۔۔ پھر اس کا بوائے فرینڈ سمر کیوں اُوب گیا اس رشتے سے چھ مہینے میں ہی؟ اسے کیوں اتنا جلد سب کچھ ریپیٹیٹیو (Repitative) لگنے لگا جس میں کک نہ ہو؟ اس کک کے لیے اس نے شرلی کو ڈرگس کی عادت ڈلوا دی۔ آج سمر تو نا معلوم کس اندھیرے میں کہیں کھو گیا اور شرلی سائکر ٹکس کی پناہ (شرن) میں اسپتال میں بھرتی ہے۔ جوجھ رہی ہے اپنے بیمار من سے۔ پچھلی بار جب اسپتال میں اس سے ملی تھی تو اس ایک گھنٹے میں بس ایک ہی بات کہی تھی اس نے۔۔۔۔ (شرلی کی اداکاری کر کے)

لانگ ڈسٹینس ٹرین میں بیٹھی تھی۔۔۔ پتہ نہیں کس انجان اسٹیشن پر اُتر گئی۔ سمجھ میں نہیں آتا آگے جانا ہے یا پیچھے! گو یا۔۔۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ (اپنے کردار میں لوٹ کر)

اُف کتنی کنفیوز تھی شرلی۔ نہیں۔۔۔ شاید ٹھہر کر رہ گئی تھی کسی ایک ہی پوائنٹ پر۔ کیا حالت ہو گئی ہے اس کی۔ (سوچ میں ڈوبی ہوئی صورت بنا کر)

یعنی شرلی کو اس کا بوائے فرینڈ ڈرگس کے سہارے جہاں لے گیا مجھے نکھل کا پریم وہاں لے جا رہا ہے؟ (گھبرا کر) نہیں۔۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ استھیوں کو پکڑ کر رکھنا ہوگا۔ (صفحہ 84)

میرا کانت کے ان ڈراموں کو پڑھتے ہوئے دیکھنے کی تسکین ہوتی ہے۔ اکثر ڈراموں کو پڑھتے ہوئے درمیان کی تفصیلات گراں گزرتی ہیں۔ کیونکہ وہ منظر کا جز ہوتے ہیں اور اسٹیج کا تقاضہ ہوتا ہے، عام قاری کہانی پڑھنا چاہتا ہے اس کی دلچسپی اسٹیج سے متعلق تفصیلات میں نہیں ہوتی ہے جبکہ میرا کانت کی درمیانی تفصیلات ڈرامے کا جزوِ لازم ہوتے ہیں۔ ان کے بغیر ناظرین اور قاری ڈرامے کی روح تک نہیں پہنچ سکتے۔ ان ڈراموں کی زبان، اسلوب اور معنوی گہرائیاں ادب کی دنیا میں میرا کانت کو اعلی مقام عطا کرتی ہیں مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ڈرامے ہمارے سماج کو آئینہ دکھانے میں کامیاب ہیں اور ہمارے ادبی ذخیرہ کا قابلِ قدر سرمایہ بھی ہیں۔

□□□

Dr. Abdul Hafiz
School of Humanities
Indira Gandhi National Open University,
93, Maidan Garhi Rd
Maidan Garhi
New Delhi-110068

محمد اویس سنبھلی

کشور جہاں زیدی کی علمی وادبی سرگرمیاں

سنبھل کی زرخیز مٹی نے ایک سے بڑھ کر ایک عالم، شعراء وادیب پیدا کیے جنھوں نے اپنی تخلیقات ونگارشات کے ذریعہ علم وادب کے سرمائے میں بیش بہا اضافہ کیا۔ منتخب التواریخ کے مصنف اور مشہور مؤرخ شیخ عبدالقادر بدایونی (1540-1615)، کے مطابق شیخ حاتم کا کوئی علمی مدمقابل نہیں تھا ان کا حافظہ غیر معمولی تھا۔ علم وفضل میں شیخ حاتم کا مقام نہایت بلند تھا، اور حدیث وفقہ میں اتنی گہری نظر تھی کہ ملا عبدالقادر بدایونی نے انھیں اپنے وقت کا ابوحنیفہ قرار دیا ہے۔ شیخ حاتم عرصۂ دراز تک سنبھل کے قاضی اور مفتی رہے، 968ھ میں ان کی وفات ہوئی، خود اپنے ہی آباد کردہ محلے حاتم سرائے میں مدفون ہیں۔ علم وادب کی یہ قدیم روایت سنبھل میں آج بھی جاری وساری ہے۔ ڈاکٹر کشور جہاں زیدی کا تعلق بھی اسی شہرِ علم وادب سے ہے۔

کشور جہاں زیدی بنت سید فرزند علی زیدی 30/اگست 1953 کو سنبھل شہر میں قلع میاں سرائے کے ایک معزز خاندان میں پیدا ہوئیں۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج سنبھل سے ہائی اسکول کیا۔ اس وقت لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم کو معیوب سمجھا جاتا تھا لیکن کشور جہاں زیدی خوش قسمت رہیں کہ انھوں نے انٹرمیڈیٹ کا امتحان پرائیویٹ دیا اور اچھے نمبروں سے کامیاب ہوئیں۔ 1974 میں بی اے اور 1976 میں ایم اے آگرہ یونیورسٹی سے کرنے کے بعد 1978 میں روہیل کھنڈ یونیورسٹی سے بی ایڈ کی سند حاصل کی۔ محسن اردو سعادت علی صدیقی کا 1971 میں مہاتما گاندھی ڈگری کالج میں جب تقرر ہوا اور انھوں نے سنبھل کے اس نئے کالج میں اپنی تدریسی ذمہ داری کا آغاز کیا تو اس وقت سنبھل بقول پروفیسر وسیم بریلوی ''ایک ادبی ریگستان'' تھا۔ تعلیمی اعتبار سے انتہائی پسماندہ اس بستی میں اپنی انتھک محنت اور لگن سے سعادت علی صدیقی نے اردو کے چراغ کو نہ صرف روشن کیا بلکہ ایسے گل بوٹے کھلائے کہ اس کا اعتراف اہل علم اور صاحبانِ بصیرت نے دل کھول کر کیا۔ انھوں نے اپنے شاگردوں کی ایک ایسی کہکشاں تیار کی جس نے ان کے کام اور ان کے مشن میں نہ صرف ان کا ہاتھ بٹایا بلکہ ان کے انتقال کے بعد اس ماحول کو زندہ رکھنے کی کوشش کی اور کافی حد تک کامیاب بھی رہے۔ ڈاکٹر تنزیل احمد، جناب نظیف الرحمٰن سنبھلی، جناب نجم جاوید عثمانی، ڈاکٹر ناصر صاحبان جیسے ان کے شاگردوں نے بھی علمی وادبی کارہائے نمایاں انجام دیے۔ کشور جہاں زیدی نے بھی اپنے ادبی سفر کا آغاز ڈاکٹر سعادت علی صدیقی کی سرپرستی میں کیا۔ بقول ڈاکٹر ریاض الاسلام حمیدی:

> ''ڈاکٹر کشور جہاں زیدی، سید فرزند علی زیدی کی صاحبزادی ہیں، شہر کے معزز خاندان سے تعلق ہے..........ادبی ذوق کی حامل ہیں۔ اس ذوق کو جلا دینے میں سعادت علی صدیقی مرحوم کا زبردست ہاتھ رہا ہے۔ موصوفہ سعادت علی صدیقی کی اس معنی میں شاگرد نہیں ہیں کہ انھوں نے ان سے پڑھا ہو بلکہ اس لحاظ سے ان کی شاگرد ہیں کہ ان کی ادبی تربیت سعادت علی صدیقی کی

مرہون منت ہے۔''

(سعادت علی صدیقی کی علمی وادبی خدمات، از ڈاکٹر ریاض الاسلام، صفحہ 96)

ڈاکٹر کشور جہاں زیدی علم وادب کا اعلیٰ ذوق رکھتی ہیں۔ان کے علمی وادبی مضامین رسائل اور اخبارات میں شائع ہو چکے ہیں۔ان کی شخصیت اپنے کارناموں کی وجہ سے اہل علم کے لیے کسی تعارف کی محتاج نہیں۔''سید سرسوی حیات اور شاعری'' موضوع پر انھوں نے مقالہ لکھ کر روہیل کھنڈ یونیورسٹی، بریلی سے 1997 میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔اس سے قبل ان کی دو کتابیں''ناول ٹکراؤ''(ہندی ترجمہ مطبوعہ 1981) اور انتخاب قصائد سید سرسوی''(مطبوعہ 1993) شائع ہو چکی تھیں۔انتخاب قصائد سید سرسوی پر تبصرہ کرتے ہوئے معروف ادیب وناقد علی جواد زیدی لکھتے ہیں''.....کشور جہاں زیدی نے سرسی ضلع مرادآباد کے اس لعلِ گمشدہ کو از سرِ نو دریافت کر کے ان کے بیش قیمت قصائد کی ترتیب کا کام اپنے ذمہ لے لیا''۔اس کتاب کا مقدمہ ڈاکٹر سعادت علی صدیقی نے لکھا ہے۔

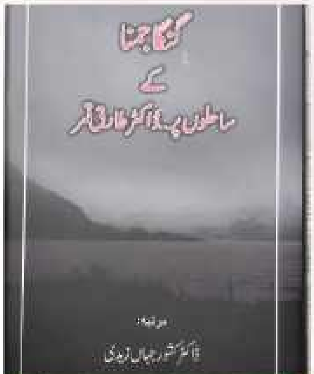

سید محمد نقوی سید سرسوی (1983-1970) کا شمار ان عظیم فن کاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے اردو شعر وادب کی بیش بہا خدمات انجام دیں لیکن ان کے فن اور شخصیت پر اہل علم کی نظر نہیں پڑی۔ بقول سعادت علی صدیقی''ہمارے نقادوں ونثر نگاروں نے مشہور ومعروف شخصیتوں پر تو بہت کچھ لکھا ہے لیکن گوشہ تنہائی میں بیٹھ کر ادب کی خاموش خدمت کرنے والے تخلیق کاروں کی طرف بہت کم توجہ دی ہے''۔کشور جہاں زیدی نے جب ریسرچ کرنے کے لیے ڈاکٹر سعادت علی صدیقی سے مشورہ کیا تو انھوں نے متعدد موضوعات کی نشاندہی کرتے ہوئے ایک نام سید سرسوی کا بھی پیش کیا تھا۔کشور جہاں زیدی نے سید سرسوی کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا۔ یہ تحقیقی مقالہ 2004 میں شائع ہو کر منظر عام پر آ چکا ہے۔ پروفیسر منظر عباس نقوی کتاب کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

''.....یہ ضروری نہیں کہ ان (ڈاکٹر کشور جہاں زیدی) کی رائے سے ہمیں اتفاق ہو لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ انھوں نے تلاش و تحقیق کا پورا پورا حق ادا کر دیا ہے۔ مجھے جس چیز نے اس مقالے میں بطورِ خاص متاثر کیا وہ مقالہ نگار کا طرزِ بیان ہے.......''۔

(پیش لفظ: منظر عباس نقوی، مشمولہ سید سرسوی حیات اور شاعری: ڈاکٹر کشور جہاں زیدی، ص9)

اس کے علاوہ''آئینہ جوہر''(مطبوعہ 2004)، تذکرہ حسینی''(فارسی سے اردو ترجمہ مطبوعہ 2008)، ''قاعدہ وقار اردو''(مطبوعہ 2014)، ''میری زمیں کے چاند ستارے''(تذکرہ شعرائے سنبھل جلد اول مطبوعہ 2016)، ''گنگا جمنا کے ساحلوں پر: ڈاکٹر طارق قمر''(مطبوعہ 2017) ان کے وہ علمی وادبی کارنامے ہیں جو اہل علم ونظر کو دعوت فکر دیتے رہیں گے۔ بقول ڈاکٹر عابد حسین حیدری:

''ڈاکٹر کشور جہاں زیدی جن کا راقم الحروف سے ایک پاکیزہ اور روحانی رشتہ ہے ....علم کے اعلیٰ مقام پر فائز ہونے کے ساتھ ساتھ ملک کی ان چند خواتین میں ہیں جو ادب کے صحیح اور صالح تصور سے آشنا ہیں۔''

ڈاکٹر کشور جہاں زیدی نے سرسی کے ایک قادرالکلام شاعر جوہر سرسوی کی غزلوں کا ایک انتخاب''آئینہ جوہر'' کے نام سے مرتب کر کے 2004 میں زیورِ طبع سے آراستہ کیا۔ نیز جوہر سرسوی کے سلام، منقبت، قطعات اور رباعیات کی تدوین بھی کی اور پھر اسے''افکار جوہر'' کے نام سے مرتب کیا ہے، یہ کتاب طباعت کے مرحلہ میں ہے اور انشاءاللہ جلد شائع ہو کر منظر عام پر آ جائے گی۔

اردو میں تذکرہ نگاری کی روایت بہت قدیم ہے۔ پہلے عربی میں پھر فارسی میں تذکرہ نگاری کا آغاز ہوا۔فارسی زبان میں شعرائے فارسی کا پہلا تذکرہ سدید الدین محمد بن عوفی نے''لباب الالباب'' کے نام سے مرتب کیا۔ ماضی کا ہندوستان فارسی علم وادب کے تناظر میں ایک اہم مرکز رہا ہے۔ ہندوستان میں ان گنت صوفیاء، مشائخ، ادباء، شعراء پیدا ہوئے جنھوں نے اپنی تخلیقات، تصنیفات اور تالیفات سے فارسی زبان وادب کا دامن بھر دیا۔ عہد مغلیہ کے صوبے''سرکار سنبھل'' نے بھی فارسی زبان و

ادب کی خدمت میں بڑا نمایاں کردار ادا کیا۔ فارسی ادب کے عظیم مورخ ملا عبدالقادر بدایونی نے یہیں رہ کر شیخ حاتم سنبھلی سے استفادہ کیا ہے۔ علاوہ ازیں اس عرصہ میں کئی اہم کتب عالم وجود میں آئیں۔ جن میں تذکرہ ''اسراریہ کشف صوفیہ'' مصنفہ شیخ محمد کمال سنبھلی، ''شرح قصیدہ عرفی'' مصنفہ مولوی محمد شفیع سنبھلی، ''طبقات الشعراء'' مرزا قدرت اللہ شوق سنبھلی، رسالہ ''سراج العارفین'' مؤلفہ مولوی محمد بہادر خاں اور تذکرہ حسینی'' و ''تشریح الحروف'' از میر حسن دوست سنبھلی قابل ذکر ہیں۔

ڈاکٹر کشور جہاں زیدی کا ایک اہم کارنامہ ''تذکرۂ حسینی'' کا فارسی سے اردو میں ترجمہ ہے۔ ''تذکرہ حسینی'' میر حسین دوست سنبھلی نے 1163ھ مطابق 1749 میں تالیف کیا تھا۔ اس تذکرہ کا شمار بارھویں صدی ہجری کے اہم فارسی تذکروں میں کیا جاتا ہے۔ اس تذکرے میں تقریباً 554 ر متقدین اور متاخرین شعراء کا ذکر کیا گیا ہے جن کی ترتیب الف بائی کے اعتبار سے پیش کی گئی ہے۔ میر حسین دوست سنبھلی نے اس تذکرے میں شعراء کے علاوہ صلحاء، عارفین اور کچھ دیگر شخصیات کا بھی ذکر کیا ہے، ان میں سے کچھ شخصیات ایسی بھی ہیں جن کی شعر گوئی سے عموماً لوگ ناواقف ہیں۔ پھر بھی اپنی نوعیت، جامعیت، تعداد شعراء کے اعتبار سے یہ تذکرہ بارہویں صدی کے تذکروں میں خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ تذکرہ 1875 میں مطبع نول کشور لکھنؤ سے شائع ہوا تھا۔ ڈاکٹر سعادت علی صدیقی کی تحریک پر کشور جہاں زیدی صاحبہ نے بڑی محنت اور لگن سے تذکرۂ حسینی کا اردو ترجمہ کیا اور 2008 میں اسے بڑے اہتمام سے شائع کیا۔ ڈاکٹر سعادت علی صدیقی نے لکھا ہے:

''سیدہ کشور زیدی صاحبہ ادبی دنیا کی جانب سے شکریہ و مبارکباد کی مستحق ہیں کہ انھوں نے تلاش بسیار کے بعد ''تذکرہ حسینی'' کا مطبوعہ نسخہ حاصل کیا اور بڑی محنت اور ریاضت سے اس کا ترجمہ کیا اور خاکسار کی تحریک پر اسے مرتب کر کے اردو ترجمے کے ساتھ شائع کرانے کا بیڑہ اُٹھایا ہے۔ اس پل صراط کے طے کرنے میں انھیں کن مشکلات و مسائل کا سامنا کرنا پڑا اور انھوں نے یہ مشکل کام کس طرح انجام کو پہنچایا اس کا اندازہ ہر وہ شخص کر سکتا ہے جو اس نوع کے کاموں کو سرانجام دیتا ہے۔ یقین ہے کشور جہاں زیدی صاحبہ کا یہ وقیع کام قبول عام کی سند حاصل کرے گا اور ادب کے طالب علم زیر نظر کتاب سے استفادہ کریں گے۔''

(''تذکرۂ حسینی'' اردو ترجمہ از ڈاکٹر کشور جہاں زیدی مطبوعہ 2008 ص 14)

ڈاکٹر سعادت علی صدیقی نے سنبھل میں اردو تذکرہ نگاری کی باقاعدہ روایت قائم کی۔ انھوں نے سنبھل کے علماء، مجاہدین آزادی اور شعراء کے تعلق سے کئی اہم تذکرے مرتب کر کے شائع کیے۔ اس سے قبل 1963 میں ''خزینۂ سخن'' اور 1978 میں ''جرس گل'' کے نام سے دو تذکرے شائع ہو چکے تھے۔ ڈاکٹر سعادت علی صدیقی نے ''چند ممتاز شعرائے سنبھل'' (چار جلدیں)، سنبھل کے مجاہدین آزادی''، ''سنبھل کے علماء کرام'' کے عنوان سے کئی تذکرہ مرتب کیے۔ اس میں کچھ سعادت صاحب کی زندگی میں شائع ہو چکے تھے نیز چند ابھی اشاعت کے منتظر ہیں۔ اس کے علاوہ ''سخن پارے''، سخنواران سنبھل'' اور ''گلزار سخن'' کے نام سے تین تذکرے اور شائع ہوئے۔ لیکن شعرائے سنبھل کے ایک جامع اور مستند تذکرہ کی ضرورت ابھی باقی تھی کہ اس اہم کام کو انجام تک پہنچانے کا بیڑہ ڈاکٹر کشور جہاں زیدی صاحبہ نے اُٹھایا۔ ''میری زمیں کے چاند ستارے'' کے نام سے تذکرہ شعرائے سنبھل کی جلد اول شائع ہو کر منظر عام پر آ چکی ہے نیز دوسری جلد زیر ترتیب ہے۔ ڈاکٹر کشور جہاں زیدی اس کام کو بڑی محنت، ریاضت اور دل جمعی کے ساتھ کر رہی ہیں۔ امید ہے جلد ہی اس کی دوسری جلد منظر عام پر آ جائے گی اور یہ سلسلہ انہی کے ہاتھوں مکمل ہوگا۔ انشاء اللہ۔ میری زمیں کے چاند ستارے یعنی تذکرہ شعرائے سنبھل کی پہلی جلد میں کل 69 ر شعراو شاعرات کا تذکرہ ہے۔ کتاب پر ''حرف چند'' کے عنوان سے ایم جی ایم پی جی کالج کے صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر عابد حسین حیدری کی قیمتی تحریر شامل ہے۔ ڈاکٹر عابد حسین حیدری لکھتے ہیں:

''میری زمین کے چاند ستارے، دراصل ڈاکٹر کشور جہاں زیدی کی وہ بازیافت ہے جو ان کے مسلسل مطالعہ اور 'نام نیک رفتگاں ضائع مکن' کے جذبہ کا بین ثبوت ہے۔ اس بے لوث کارنامے پر تبصرہ کرنا اہل علم اور صاحبان نظر کا حق ہے لیکن اتنا ضرور عرض کیا جا سکتا ہے کہ اس تذکرے میں تمام شعرائے سنبھل کے فکر و فن کا چاہے جائزہ نہ لیا گیا ہو لیکن باغ، غفور، طور، عندلیب شادانی، بہار اور معجز جیسے اساتذہ فن کا جہاں ذکر ہے وہیں موجودہ عہد کے اساتذہ نسیم الظفر، کیفی سنبھلی اور ڈاکٹر طاہر رزاقی کے فکر و فن کا بھی احاطہ کیا گیا ہے ساتھ ہی مخمور جمالی، مصور سبزواری، اعجاز وارثی، حنیف ترین جیسے جدید لب و لہجہ کے شاعروں کے کلام پر بے لاگ تبصرہ بھی ہے لیکن خاص بات یہ ہے کہ درج بالا شعراء کے کلام پر تبصرہ و تجزیے وطن کی محبت کے

تحت قصیدہ خوانی نہ بن کر ایک متوازن نقطہ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔''

(''حرف چند''، مشمولہ میری زمیں کے چاند ستارے از ڈاکٹر کشور جہاں زیدی مطبوعہ 2016 ص11)

ڈاکٹر کشور جہاں زیدی کی تحقیقی و تخلیقی صلاحیتوں کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر نسیم الظفر رقمطراز ہیں:

''محترمہ کشور جہاں زیدی نہ صرف تحقیقی یا تدوینی بلکہ تخلیقی صلاحیتوں کی بھی مالکہ ہیں۔ اس لیے ان کی تحریریں اپنے ہم عصروں کے مقابلے کہیں زیادہ اہم اور وقیع ہوتی ہیں۔ ان کی تحریروں میں تخلیقیت کا دل بھی دھڑکتا ہے اور یہ کبھی کبھی نئی نظم یا نظم نثری کا احساس بھی دلاتی نظر آتی ہیں اور خلاقیت کے نئے ابعاد بھی ایجاد کرتی ہیں۔

(''دردآشنائی''، مشمولہ میری زمیں کے چاند ستارے از ڈاکٹر کشور جہاں زیدی مطبوعہ 2016 ص14)

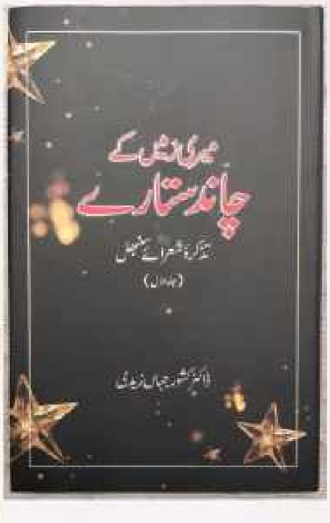

نوجوان شاعر طارق قمر کی ادبی و شعری خدمات کے اعتراف میں لکھے گئے مضامین کا خوبصورت مجموعہ ''گنگا جمنا کے ساحلوں پر: ڈاکٹر طارق قمر'' کے عنوان سے مرتب کیا۔ 436 رصفحات پر مشتمل اس کتاب میں مرتب ڈاکٹر کشور جہاں زیدی کے علاوہ اردو کے 51 رمعروف وغیر معروف قلم کاروں کے مضامین شامل ہیں۔ کتاب کے آخر میں ڈاکٹر طارق قمر کا منتخب کلام شامل کیا گیا ہے۔ اگر اس مجموعے میں شمس الرحمٰن فاروقی، پروفیسر شارب ردولوی، پروفیسر ملک زادہ منظور احمد، گلزار دہلوی، پروفیسر وسیم بریلوی، ندا فاضلی، مخمور سعیدی، ڈاکٹر صبیحہ انور، راحت اندوری اور منور رانا جیسے عظیم قلم کاروں وفنکاروں کے مضامین ہی شامل ہوتے اور باقی صفحات طارق قمر کی تخلیقات سے پُر کردیے جاتے تب بھی یہ ایک قابل قدر مجموعہ ہوتا لیکن اس میں تو ایسے مضامین شامل کردیے گئے ہیں جن میں طارق قمر کی شخصیت کے ہر پہلو پر سیر حاصل روشنی ڈالی گئی ہے۔ ایک نوجوان فن کار کو متعارف کرانے اور اور اس کے فن کی قدردانی کا اسے ایک عمدہ نمونہ کہا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر کشور جہاں زیدی اس کے لیے مبارکباد کی مستحق ہیں۔

ڈاکٹر کشور جہاں زیدی درس وتدریس کے شعبہ سے وابستہ رہیں۔ بی ایڈ کرنے کے بعد 1981 میں ان کا تقرر آزاد گرلس انٹر کالج میں ہوگیا اور یہیں سے سبکدوش ہوئیں۔ اترپردیش اردو اکادمی نے ان کی کئی کتابوں پر انعامات دئے نیز مختلف سماجی تنظیموں نے ان کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں انھیں اعزازات سے نوازا۔

ڈاکٹر کشور جہاں زیدی کی حیات وخدمات کے اس مختصر جائزے سے یہ بات بلاخوف وتردید کہی جاسکتی ہے کہ کشور جہاں زیدی نے علم و تحقیق کی ایک ہوش مند دنیا سے اپنا مستحکم رابطہ رکھا۔ علم وتحقیق کی دنیا میں وہ سنجیدگی اور توجہ سے اپنے مقصد پر نظر رکھتی ہیں۔ صارفی اور مادی دنیا کے اس دور میں ان کی کوشش یہ رہی ہے کہ علم وتحقیق کچھ اہم موضوعات پر سنجیدگی سے کام کیا جائے اور بلاشبہ اس میں وہ کامیاب ہیں۔ ان کتابوں کے مطالعے سے ان کی علم دوستی کا ایک اہم پہلو یہ سامنے آتا ہے کہ ان کے اندر تلاش وتحقیق کا داعیہ موجود ہے۔ ڈاکٹر کشور جہاں زیدی کی یہ تحقیقی سلیقہ مندی ہے کہ مواد کی پیشکش میں اپنی ذات کو دخیل نہیں ہونے دیتیں اور اس طرح وہ ایک غیر جانب دار محقق کے طور پر سامنے آتی ہیں۔ ڈاکٹر کشور جہاں زیدی کا علمی سفر ان کی محبت اور پیہم کوشش سے عبارت ہے۔ ان کتابوں سے ان کے مطالعہ کی سنجیدگی، توجہ اور انہماک کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ بھی کہ خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ علم وتحقیق کا سفر کبھی رائیگاں نہیں جاتا۔ ان کی یہ کوششیں پیہم جاری ہیں۔ یہی ان کی کامیابی وکامرانی ہے۔

□□□

Mohd. Ovais Sambhli
178/157, Barood Khana
Golaganj
Lucknow - 226 018(U.P)

ڈاکٹر یاسمین خاتون

پریم چند کے افسانوں کا تجزیہ

پریم چند کی افسانہ نگاری نے اپنی تیس سال کی عمر میں ترقی کی کئی منزلیں طے کی ہیں۔ گذرتے ہوئے وقت اور بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ جس طرح اُن کے تصورات بدلے، اُن کا شعور نکھرا، اسی طرح ان کی کہانیاں بھی موضوع، مواد اور فن کے اعتبار سے سنورتی رہیں۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''سوزِ وطن'' 1909 میں شائع ہوا۔ مجموعے کی تمام تر کہانیوں کا موضوع وطن کی محبت کا پاکیزہ جذبہ ہے۔ فنی اعتبار سے ان کی کہانیوں میں بہت سے نقائص ہیں مگر وہ اس دور کی یادگار ہیں جب پریم چند فنِ افسانہ نگاری کی باریکیوں سے اچھی طرح واقف نہیں ہوئے تھے اور قدیم قصہ کہانیوں کے تمثیلی اور فوق الفطری پیرایہ میں ایثار، اخوت اور حب الوطنی کے گیت گانے ہی کو افسانہ نگاری سمجھتے تھے۔ اس کے بعد کے افسانہ کو انھوں نے اپنے اردگرد کی زندگی کے حقائق کا آئینہ دار بنایا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ملک میں ہر طرف قومی اصلاح کی تحریکیں سرگرمِ عمل تھیں۔ پریم چند نے بھی اپنی کہانیوں میں سماجی برائیوں کے خلاف آواز بلند کی۔

انھوں نے طاقتور کے مقابلہ میں مظلوم کی حمایت کی۔ ہندوستانی سماج میں عورت کی بیچارگی، جہیز کی رسم، ذات پات کی تفریق، اچھوتوں کی کسمپرسی اور کسانوں کی غربت زدہ زندگی، یہی ان کی اس دور کی بیشتر کہانیوں کے موضوع ہیں۔ اس طرح پریم چند نے اپنے افسانوں میں عام اور ادنی انسانوں کی زندگی کی تصویریں پیش کیں اور اپنے فن کو قومی فلاح اور سماجی اصلاح کا وسیلہ بنایا۔ ان کی اس طرز کی کہانیوں میں پریم پچیسی، پریم بتیسی اور دوسرے مجموعوں میں ملتی ہیں۔

اب انھیں کہانی کہنے کا ڈھنگ آ گیا تھا۔ وہ جو بات بھی کہنا چاہتے اس انداز سے کہتے کہ پڑھنے والے کے دل میں اتر جاتی۔ فن اور تکنیک پر انھیں ایسی قدرت حاصل ہوگئی تھی کہ معمولی سے معمولی واقعہ کے بیان میں بھی پڑھنے والے کے لیے دلچسپی اور دلکشی کے سامان پیدا کر دیتے۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ انھوں نے زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اتنے زاویوں سے اور اتنی صورتوں اور حالتوں میں دیکھا کہ اس کی کوئی ادا ان سے ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ یہی نہیں بلکہ انسان اور فطرت کی باریکیوں اور اس کے جذبات کے تہہ در تہہ حالتوں اور کیفیتوں کا انھوں نے بڑی گہرائی سے مطالعہ کیا تھا۔ کہانیوں میں انسانی جذبات، غم و غصہ، رشک و رقابت اور مسرت و حسرت کے جیتے جاگتے مرقعے ملتے ہیں۔

ان کے کرداروں کے دل کی دھڑکن کو ہم اپنے دل کی دھڑکن محسوس کرتے ہیں۔ ہم ان کے غم کے ساتھ غمگین ہوتے ہیں اور ان کی خوشیاں دیکھ کر مسکرا اُٹھتے ہیں۔

پریم چند کی اس دور کی کہانیوں اور ناولوں میں ایک خاص بات یہ ہے کہ وہ جس زندگی کی تصویریں کھینچتے ہیں وہ ہماری ہی دنیا کی اور حقیقی ہوتی ہے لیکن اس زندگی کے مسائل کو جس نقطۂ نظر سے حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ تخیلی اور مثالی ہوتا ہے۔ ان کے ایک ناقد ڈاکٹر رام رتن بھٹناگر نے ایک موقع پر لکھا ہے:

''ان کی بیشتر کہانیوں کا انجام زندگی کے بارے میں ایک مثالی تصور یا زاویہ نظر پیش کرتا ہے۔ انھیں پڑھ کر اکثر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہر اچھے کام کا انجام اچھا ہوتا ہے۔ تاریکی پر روشنی اور شر پر خیر کی فتح ہوتی ہے۔ (حالانکہ) ہم جس زندگی سے مانوس ہیں عام حالات میں اس میں ایسا نہیں ہوتا۔''

پریم چند کے فن کی سب سے بڑی کمزوری یہی ہے کہ وہ اپنے کرداروں کو اپنے اصلاحی مقاصد کے تابع رکھتے ہیں۔ انھیں اپنے طور پر سوچنے سمجھنے اور نقل وحرکت کرنے کی آزادی نہیں دیتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کہانیوں کا انجام، کہانی کے واقعات کا فطری اور منطقی نتیجہ نہیں ہوتا۔ یہ رجحان پریم چند کے یہاں آہستہ آہستہ کم ہوتا گیا اور وہ سماجی حقیقت نگاری کی طرف بڑھتے گئے۔ مقصد کے بجائے کردار، ماحول اور واقعہ کی جزئیات کی طرف اپنی توجہ مبذول کرنے لگے۔ ان کے فن کے ارتقا کی یہ آخری منزل ہے۔ اصلاحی مقاصد اب بھی ان کے پیشِ نظر تھے لیکن اب وہ اس راز کو پا چکے تھے کہ مقصد کی تبلیغ فن نہیں، مقصد کو چھپانا فن ہے۔ فنکار واعظ یا سیاسی رہنما کی طرح برسرِ عام اپنے خیالات کی اشاعت نہیں کرتا بلکہ فن کے پیرایہ میں آہستہ آہستہ اور غیر محسوس طور پر لوگوں کو اپنا ہم خیال اور اپنے نقطۂ نظر کا حامی بناتا ہے۔ پریم چند کے اس دور کی کہانیاں زادِ راہ اور واردات وغیرہ میں ملتی ہیں۔ یہاں میں صرف واردات کی کہانیوں کو پیشِ نظر رکھ کر پریم چند کی افسانہ نگاری کا جائزہ لوں گی۔

'واردات' تیرہ کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ تیرہ کہانیوں میں پریم چند نے ہندوستان کے تمام طبقوں کی زندگی، الجھنیں اور ان کی گھریلو زندگی کے مسائل بھی ہیں اور کسانوں کی معاشی زبوں حالی، ان کی فطرت کی سادگی اور معصومیت کی اچھوتی تصویریں بھی۔ اس میں ہمیں لالہ مراری لال اور سیٹھ نانک چند جیسے لکھ پتی سیٹھ اور سرمایہ دار بھی نظر آتے ہیں اور گنگو اور جوکھو جیسے مفلس اور مزدور بھی، کاماناتھ اور دیاناتھ جیسے خودغرض، بے رحم اور لالچی بیٹے بھی اور اپنی آن اور غیرت پر جان دینے والی بیٹی بھی۔

الغرض ان کہانیوں کے کردار اس دور کی زندگی کے نمائندہ کردار ہیں۔ پریم چند کی حقیقت نگاری نے ان کہانیوں میں فن کی بلندیوں کو چھولیا ہے۔

اپنی افسانہ نگاری کے بارے میں پریم چند نے ایک مضمون میں لکھا ہے:

''میرے اکثر قصے کسی نہ کسی مشاہدے یا تجربے پر مبنی ہوتے ہیں..... مگر محض واقعہ کے اظہار کے لیے میں کہانیاں نہیں لکھتا۔ میں اس میں کسی فلسفیانہ یا جذباتی حقیقت کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔''

پریم چند کی یہ کہانیاں بھی زندگی کے بعض اہم جذباتی اور نفسیاتی حقائق کی نقاب کشائی کرتی ہیں۔ نوعیت کے اعتبار سے ان کہانیوں کو ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

(1) ایسی کہانیاں جن میں واقعات کسی ایک کردار کے گرد گھومتے ہیں اور اس کی زندگی کے کسی خاص حصہ یا خاص پہلو کو نمایاں کرتے ہیں۔ ایسی کہانیوں میں واقعات کی اہمیت پر زور نہیں دیا جاتا بلکہ ساری توجہ کردار نگاری پر ہوتی ہے۔ واقعات کردار کے ارتقاء اور اس کے نفسیاتی خدوخال نمایاں کرنے میں معاون ہوتے ہیں۔

(2) دوسری قسم کی کہانیاں وہ ہیں جن میں واقعات بجائے خود بڑی اہمیت رکھتے ہیں، وہ کرداروں کو آگے نہیں بڑھاتے ہیں، کردار انھیں آگے بڑھا کر آخر تک پہنچاتے ہیں اور اس طرح پڑھنے والا زندگی کی اس اہم حقیقت تک رسائی حاصل کرتا ہے جو اس کہانی کا مقصد ہوتا ہے۔

پہلی قسم کی کہانیوں میں شکوہ وشکایت، شانتی اور مالکن اس مجموعے کی نمائندہ کہانیاں کہی جاسکتی ہیں۔ شکوہ وشکایت کو دراصل افسانہ کہنے کے بجائے ایک کردار کا خاکہ کہنا چاہیے لیکن پریم چند نے ایسے دلچسپ اور دل نشیں انداز سے اس خاکہ میں رنگ بھرا ہے کہ افسانہ کا لطف پیدا ہو گیا ہے۔ اس میں انھوں نے نچلے متوسط گھرانے کے ایک فرد کے عادات واطوار کی کہانی خود اس کی شریکِ زندگی کی زبانی بیان کی ہے۔ اس سرمایہ دارانہ سماج میں جہاں خودغرضی، مکاری اور چاپلوسی کامیابی اور ترقی کے زینے ہیں، خلوص، دیانت، انسانیت اور عزتِ نفس انسانی کمزوریوں کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس کہانی میں ایک بیوی اپنے شوہر کی ایسی ہی کمزوریوں کا شکوہ کرتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس بہانے پریم چند نے خود اپنے کرداروں کو بے نقاب کیا ہے۔ انھیں بھی تمام زندگی ناکامیوں سے کام رہا لیکن انسانیت، دیانت، شرافت کا دامن ان کے ہاتھوں سے کبھی نہیں چھوٹا۔ ان کی بیوی شورانی دیوی نے ایسی ان گنت کمزوریوں کا شکوہ کیا ہے، لیکن اس کے باوصف وہ ان سے والہانہ محبت کرتی تھی اس لیے کہ ان ہی کمزوریوں نے انھیں ایک عظیم انسان بنایا تھا۔ ان کی کہانیوں کا ہیرو بھی انسانیت کے اعلیٰ معیار پر پورا اترتا ہے اور اس کی بیوی آخر میں یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔

''لیکن سارے عیوب کے باوجود، میں انھیں پیار کرتی ہوں، ان میں وہ کونسی خوبی ہے، جس پر میں فریفتہ ہوں، مجھے خود نہیں معلوم لیکن شاید آج میں ان کی برائیوں کو خوبیوں سے تبدیل

کرنے پر بھی تیار نہیں۔“

’شانتی‘ کہانی کا موضوع بے میل شادی اور اس کے المناک نتائج ہیں۔ یوں تو اس میں کئی کردار ہیں لیکن کہانی سنیتا کے گرد گھومتی ہے۔ وہ ایک شائستہ، متوسط گھرانے کی تعلیم یافتہ غیرت منداور خوددار لڑکی ہے۔ وہ محبت کے بدلے محبت چاہتی ہے لیکن اس کی شادی شہر کے ایک رئیس مداری لال کے بیٹے کیدار ناتھ سے کر دی جاتی ہے۔ کیدار ناتھ دولت اور جوانی کے نشہ سے سرشار ایک آوارہ اور عیاش انسان ہے۔ سنیتا نے بھی اس کی بے توجہی، سرد مہری کا جواب سرد مہری سے دیا ہے۔ اس نے خاموشی سے سب کچھ برداشت کیا لیکن اپنے شوہر کے سامنے جھکنا گوارا نہ کیا۔ ایک روز جب کیدار ناتھ ایک ایکٹریس کے ساتھ یہ کہہ کر فرار ہو گیا تھا، جب تک سنیتا گھر میں ہے، میں نہیں آؤں گا۔

سنیتا نے بھی اپنی مانگ کا سیندور چھٹا کر اپنی بیوگی کا اعلان کر دیا اور بڑی خاموشی اور دلیری کے ساتھ اپنی زندگی جمنا کی مقدس لہروں کی آغوش کو سونپ دی اس لیے کہ وہ ٹوٹ سکتی تھی لیکن اُسے جھکنا پسند نہیں تھا۔ اس کی موت کی خبر پا کر اس کی ماں گویا کہتی ہے، میں خوش ہوں کہ اس نے اپنی آن نبھا دی، اپنی غیرت اور خودداری کے لیے جان دے دی۔

پریم چند اگر یہ کہانی اپنے ابتدائی دور میں لکھتے تو سنیتا کی خودداری اور سرکشی کو کسی طرح جائز قرار نہ دیتے بلکہ اسے پتی ورتا استری کا لباس پہنا کر عیاش شوہر کی پرستش کرنے اور خدمت و محبت سے اسے راہِ راست پر لانے کے لیے مجبور کرتے۔ اس سے ظاہر ہے کہ آخر زمانہ میں ان کے تصورات کس درجہ بدل گئے تھے۔ اسی طرح ’مالکن‘ کہانی میں رام پیاری کا کردار پیش کرتے ہوئے پریم چند نے اصلیت اور حقیقت سے تجاوز نہیں کیا۔ اس کے نفسیاتی پیچ و خم دکھاتے ہوئے انھوں نے بڑی خوبی سے ان خارجی حالات کا تجزیہ کیا ہے جو اس کی زندگی کی نئی راہوں کا تعین کرتے ہیں۔ جوانی ہی میں ان کے شوہر کا انتقال ہو جاتا ہے، اس کا نیک دل خسر اسے گھر کی مالکن بنا کر اس کی زندگی کے اس خلاء کو پُر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ کچھ عرصے تک ذمہ داریوں کے بوجھ اور ان کی محبت نے اس کے لطیف جذبات کو سر اٹھانے کا موقع نہیں دیا۔

لیکن خسر کی موت کے بعد جب وہ گھر میں تنہا رہ گئی، فصلیں اچھی ہوئیں اور اتنا روپیہ بھی بچ گیا کہ اس نے اپنے گروی زیور بھی چھڑا لیے اور نئے کپڑے بنوا لیے تو اس کی زندگی نے ایک نئی کروٹ لی۔ معاشی آسودگی اور بے فکری سے اسے اپنی زندگی کے خلا کا احساس ہونے لگا۔ وہ اپنے وفادار نوکر جوکھو کے خلوص اور محبت کی قدر کرتی تھی لیکن اب وہ اسے کچھ اور قریب محسوس ہونے لگی۔ اس کی نگاہِ کرم اور سپردگی دیکھ کر جوکھو میں بھی اپنے دل کی بات کہنے کی ہمت ہوئی اور انجام کار پیاری کی زندگی کا وہ خلا پُر ہو گیا۔ اس کہانی میں بھی پریم چند کا نقطۂ نظر حقیقت پسندانہ ہے۔ انتہائی مؤثر اور فنکارانہ اسلوب میں انھوں نے ایک اہم سماجی مسئلہ کا حل پیش کیا ہے۔ مکالموں کی زبان نہ صرف فطری ہے بلکہ کرداروں کے جذبات کی شدت اور گہرائی کے ترجمان ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پریم چند کو ہر طبقہ کی زبان اور بول چال پر کتنی قدرت حاصل تھی۔

دوسری قسم کی کہانیوں میں بدنصیب ماں، روشنی، دوسری بیوی اور قاتل کی ماں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ بدنصیب ماں، ایک ایسی ماں کا المیہ ہے، جس نے اپنے خونِ جگر سے چار بیٹیوں کی پرورش کی، انھیں اعلیٰ تعلیم دلائی، ان کے گھر بسائے، اپنے شوہر اجودھیا ناتھ کی زندگی تک وہ گھر کی مالکن تھی، سارا گھر اس کے اشاروں پر چلتا تھا لیکن ان کے مرتے ہی اس گھر کی بساط الٹ گئی۔ لڑکوں نے سارے اثاثہ پر قبضہ کر لیا۔ روپے کے لالچ میں اپنی معصوم اور بے زبان بہن کلو کی شادی بوڑھے دین دیال سے کر دی اور ماں کے حقوق اس طرح بھول گئے جیسے اس کا وجود ہی نہیں۔ وہ اب گھر کی مالکن نہیں نوکرانی تھی۔ سارا دن گھر کا کام کرتی، جھاڑو دیتی، پانی بھرتی اور ایک چھوٹے سے کمرے میں خاموش پڑی رہتی۔ کوئی اس کے دکھ درد کو پوچھنے والا نہ تھا۔ آخر ایک روز جب وہ گنگا سے پانی بھرنے گئی تو اس کی تند و تیز موجیں اسے بہا لے گئیں۔ اس کے ساتھ اس کی زندگی کے دکھ بھی ڈوب گئے۔

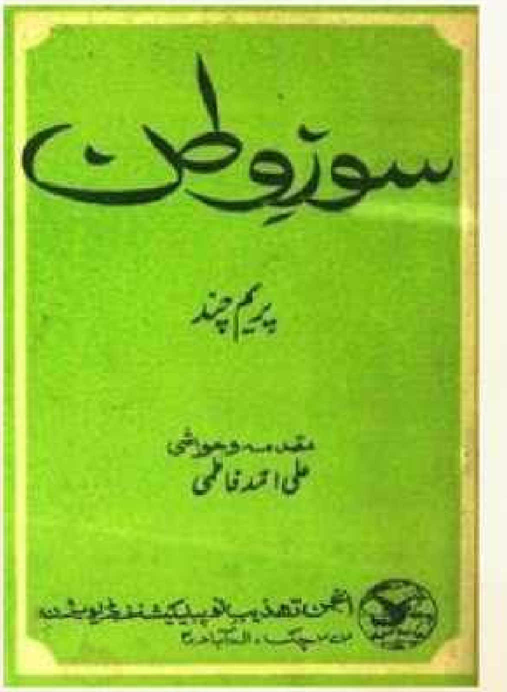

پریم چند نے اس کہانی میں اپنے عہد کی ایک تلخ حقیقت کی عکاسی کی ہے۔سرمایہ دارانہ نظام میں دولت کی ہوس انسان کو اس درجہ خود پرست، خودغرض اور بے رحم بنا دیتی ہے کہ وہ فرض، محبت، ایثار اور انسانیت کے پاکیزہ جذبات سے بالکل عاری ہو جاتا ہے۔ دولت کے لیے وہ بہن کو بیچ سکتا ہے اور بوڑھی ماں کی زندگی کو جہنم بنا سکتا ہے۔

'روشنی' میں پریم چند کی افسانہ نگاری کی ایک اور خصوصیت سامنے آتی ہے اور وہ ہے فضا اور مناظر قدرت کی عکاسی۔ اس کہانی میں انھوں نے ایک کوہستانی علاقہ کے طوفان کی جیتی جاگتی تصویریں پیش کی ہیں اور اس پس منظر میں دیہات کی ایک ایسی معصوم عورت کا کردار پیش کیا ہے جو بیوہ اور بے سہارا ہے۔ وہ محنت مزدوری کر کے اپنے بچوں کا پیٹ پالتی ہے۔اس کے دل میں انسانیت کا درد ہے اور مفلسی کے باوجود کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتی۔اس علاقہ کا ایک مغرور اس کی سادگی اور اس کی خودداری، توکل اور انسانیت سے اس درجہ متاثر ہوتا ہے کہ اس کی دنیا ہی بدل جاتی ہے اور اپنی جان پر کھیل کر ایک اندھے اور لاچار بڈھے کو ڈوبنے سے بچاتا ہے اور اسے لاد کر مندر تک لاتا ہے لیکن اس کا دل ایک فاتحانہ مسکراہٹ سے جگمگا اُٹھتا ہے۔ یہ روشنی اس کے نفس کی سیاہی پر فتح پالیتی ہے اور جب وہ غریب اندھا اس سے کہتا ہے:

"تم کون ہو بھائی، تمھارے سر پر کسی دیوی کا سایہ معلوم ہوتا ہے۔"

"قاتل کی ماں" اس مجموعہ کی آخری کہانی ہے۔اس کا موضوع ہے تشدد اور عدم تشدد کا فلسفہ۔ پریم چند نے فنکارانہ چابک دستی اور غیر جانبداری کے ساتھ دونوں تصورات کی نمائندگی کی ہے۔ وِنود کی ماں رامیشوری کا دل وطن کی محبت سے سرشار ہے۔ وہ ملک کی آزادی کے لیے ہر چیز قربان کر سکتی ہے۔ وہ مہاتما گاندھی کے عدم تشدد کے فلسفہ پر ایمان رکھتی ہے۔اس کے دل میں انسانیت کا درد اور صداقت کا احترام ہے۔اس کے برخلاف وِنود حصولِ آزادی کے لیے تشدد کو جائز سمجھتا ہے اور اہنسا کو بزدلی کہتا ہے۔ وہ ایک انگریز افسر کو قتل کر دیتا ہے۔ رامیشوری قاتل بیٹے کو پناہ دینے سے انکار کر دیتی ہے۔ وہ فرار ہو جاتا ہے۔ قتل کے جرم میں دوسرے بے گناہوں پر مقدمہ چلتا ہے۔ رامیشوری اپنے بیٹے کی محبت کے مقابلے میں فرض کو ترجیح دیتی ہے اور عدالت میں پہنچ کر اعتراف کر لیتی ہے کہ اصل قاتل وِنود ہے، لیکن جیسے ہی یہ الفاظ اس کے منہ سے نکلتے ہیں وِنود اس کے سینے میں خنجر پیوست کر دیتا ہے اور اس طرح ماں کے محبت کے مقابلے میں وہ اپنا فرض ادا کرتا ہے کیوں کہ رامیشوری اس کے فلسفہ کے مطابق ملک وقوم کی غدار ہے۔ دونوں میں سے کون سچائی اور حق پر ہے اس کا فیصلہ پریم چند نے قاری پر چھوڑ دیا ہے اور اس طرح حقیقت نگاری کا حق ادا کیا ہے۔ پریم چند نے اس طرح کی بہت سی کہانیاں لکھی ہیں اور ان کے وسیلے سے اپنے ہم وطنوں کو غلامی کی زنجیروں کی گرانباری کا احساس دِلایا ہے۔

پریم چند اپنی کہانیوں میں اپنے مقصد کے حصول کے لیے کبھی کبھی طنز و مزاح سے بھی کام لیتے ہیں۔ مزاح وہ کہیں مکالموں سے پیدا کرتے ہیں، کہیں واقعات سے اور کہیں ایسے کردار تخلیق کر کے جو بجائے خود مضحک اور مضحکہ خیز ہوتے ہیں۔ مفت کرم داشتن میں انھوں نے واقعات کے ذریعے مزاح پیدا کیا ہے اور ایسی سوسائٹی پر طنز کیا ہے جہاں انصاف رشوت اور سفارش کے ترازو پر تولا جاتا ہے۔ 'سوانگ' میں مکالموں سے مزاح پیدا کیا ہے۔ گجندر سنگھ کا کردار اتنا مضحک نہیں جتنا دلچسپ ہے۔ پڑھنے والا اس کی کمزوریوں پر ہنستا نہیں بلکہ زیرلب مسکراہٹ کے ساتھ اس کی چرب زبانی اور حاضر دماغی کی داد دیتا ہے۔ وہ اپنی سسرال میں اپنی بیوی شیاما کے ساتھ رہ رہا ہے۔ ایک رات شیاما کی کچھ سہیلیاں ڈاکوؤں کا بھیس بدل کر آتی ہیں، انھیں دیکھتے ہی گجندر سنگھ خوف سے کانپ اُٹھتا ہے، دم مارنے کی ہمت نہیں ہوتی، یہاں تک کہ وہ فرضی ڈاکو شیاما کو اُٹھا لے جاتی ہے، لیکن صبح کو جب اس پر اس سوانگ کا راز افشا ہوتا ہے تو وہ بڑی بے ساختگی سے کہتا ہے: تو کیا میں تمھارا سوانگ بگاڑ دیتا، میں بھی اس تماشہ کا لطف اُٹھا رہا تھا۔ اور سب حیرت وندامت سے دم بخود رہ جاتے ہیں۔

الغرض پریم چند کی کہانیوں کا یہ مجموعہ ان کی فنی پختگی، زبان و بیان پر ان کی ماہرانہ قدرت اور ان کے اعلیٰ مقاصد کا آئینہ دار ہے۔ ان کہانیوں کے پلاٹ رواں اور سیدھے ہیں اور ان میں سے بیشتر قدیم قصہ کہانیوں کے انداز پر بیانیہ رنگ میں لکھی گئی ہیں لیکن پریم چند نے واقعہ کی صرف ان ہی جزئیات اور تفصیلات کو بیان کیا ہے جو وحدتِ تاثر کے حصول میں ممد و معاون ہیں۔ ان کہانیوں کا ہر کردار ایک واضح اور منفرد شخصیت کے روپ میں ہمارے سامنے آتا ہے اور چند ساعتوں میں ہم سے مانوس ہو جاتا ہے۔ ہم اسے بڑے سے بڑے مجمع میں پہچان سکتے ہیں۔ ان کہانیوں میں ہم ہندوستانی تہذیب و معاشرت کی حقیقی تصویر دیکھتے ہیں۔ یہ مصوری پریم چند کی فنکارانہ صلاحیت اور اس کی عظمت کا ثبوت ہے۔

Dr. Yasmin Khatoon
Guest Faculty, Dept. of Urdu
Maulana Mazharul Haque Arabic & Persian University
34, Ali Imam Path, Rajbansi Nagar
Patna-800001 (Bihar)

بلال احمد ڈار

ہندوستان کی اہم خواتین

طنز و مزاح نگار

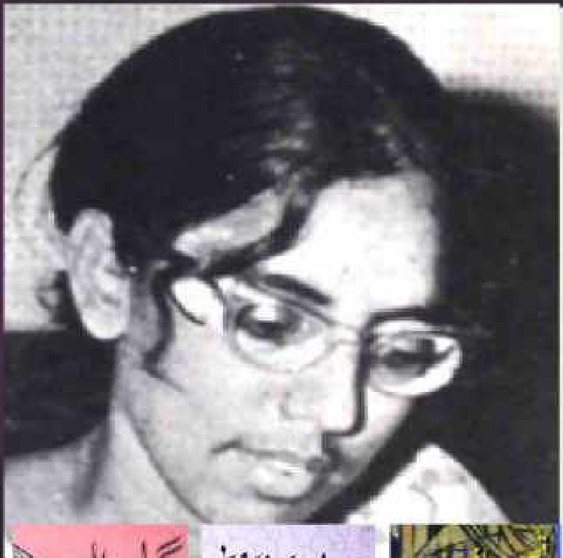

طنز و مزاح کیا ہے؟ اس کی کوئی جامع تعریف کرنا مشکل ہے تاہم ہمارے نقادوں نے اس کے مفہوم کو سمجھانے کی کوشش کی ہے اور اس کی تعریف مختلف آراء کی روشنی میں کی ہے۔ مزاح کو انگریزی میں Humour کہتے ہیں جس کے معنی خوش طبعی کے ہیں۔ یہ ایک ایسا رجحان ہے جس میں ہنسی کو پُر لطف اور دلکش انداز میں لوگوں کے بیچ رکھا جاتا ہے۔ مزاح کا مقصد حصولِ مسرت کے سوا کچھ نہیں ہوتا اور یہ زندگی کے مضحک پہلوؤں کی نقاب کشائی کا نام ہے۔ طنز انگریزی لفظ Satire کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جس کے معنی طعنہ دینا یا وہ بات جو طعنے کے طور پر کہی جائے۔ طنز کسی کے مذاق اُڑانے کا دوسرا نام ہے۔ طنز کی پیدائش اس وقت ہوتی ہے جب معاشرہ بدحالی کا شکار ہو اور انسانی زندگی ناہمواریوں میں مبتلا ہو جائے۔ طنز و مزاح کی بدولت معاشرے کے بگاڑ کو خوش اسلوبی کے ساتھ سلجھایا جاتا ہے۔ طنز و مزاح نگاری کا تعلق کافی حد تک انسانی ذہن سے ہوتا ہے۔ اس کا کوئی باقاعدہ اصول نہیں ہے۔ ایک مضمون نگار اپنی تخلیق میں مزاح اور طنز کا رنگ پیدا کرنے کے لیے مختلف طریقے اپناتا ہے۔ عام طور پر طنز و مزاح کو بھی ادب کی ایک صنف کا درجہ دیا جاتا ہے، لیکن یہ ایک اسلوب یا طریقہ اظہار یا تکنیک ہے، جس کی اپنی کوئی ہیئت نہیں ہے۔ طنز و مزاح نثر اور شاعری کی ہر صنف میں برتا جا سکتا ہے۔ نظم و نثر کی تمام اصناف غزل، قصیدہ، مثنوی، رباعی، افسانہ، ناول، خاکہ اور انشائیہ میں اس کو برتا گیا ہے۔

اردو میں طنز و مزاح کی روایت قدیم زمانے سے چلی آ رہی ہے۔ نثر میں اس کے ابتدائی نقوش داستانوں میں مل جاتے ہیں اور شاعری میں اس کے نقوش ولی دکنی، جعفر زٹلی کی شاعری میں مل جاتے ہیں۔ سودا نے ہجو گوئی میں اپنی ایک الگ راہ نکالی اور ہجو گوئی میں کمال پیدا کیا۔ نظیر اکبر آبادی کی شاعری میں طنز اور مزاح بڑی خوبصورتی سے ایک دوسرے میں سموئے ہوئے ہیں۔ اردو مزاح نگاری میں غالب کا نام سب سے اہم مانا جاتا ہے اور اگر اردو نثر کا بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ اردو نثر میں طنز و مزاح کا آغاز اصل میں غالب کے خطوط سے ہی ہوا۔ اودھ پنچ اردو ادب میں طنز و مزاح کی روایت کو ایک نیا موڑ دینے میں اپنی مثال آپ ہے۔ اس کے بعد طنز و مزاح کے حوالے سے اہم نام سامنے آتے ہیں جن میں خواجہ حسن نظامی، فرحت اللہ بیگ، رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری، کنہیا لال کپور، ملا رموزی، شفیق الرحمٰن، کرشن چندر وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

اردو طنز و مزاح کی صف میں صرف مرد حضرات ہی نہیں تھے بلکہ آزادی کے بعد اُبھرنے والے طنز و مزاح نگاروں میں چند خواتین بھی شامل ہیں جنھوں نے اپنی مزاحیہ تخلیقات سے اردو ادب کا دامن وسیع کیا۔ ان خواتین طنز و مزاح نگاروں نے مردوں کے دوش بدوش کھڑے ہو کر اپنی تحریریں پیش کر کے اردو ادب میں اپنا اہم مقام حاصل کیا۔ آزادی کے

بعد اُبھرنے والی طنز و مزاح نگاروں میں شفیقہ فرحت، ڈاکٹر انیس سلطانہ، پروفیسر خورشید جہاں، ڈاکٹر فرزانہ فرح، ڈاکٹر حلیمہ فردوس، نسیمہ تراب الحسن وغیرہ کا نام قابل ذکر ہے۔ اردو ادب میں ابتدا سے ہی خواتین نے نظم و نثر کے حوالے سے اپنا نام روشن کیا ہے، لیکن جہاں تک اردو طنز و مزاح کا تعلق ہے تو شفیقہ فرحت پہلی خاتون ہیں جنھوں نے طنزیہ و مزاحیہ مضمون لکھ کر ادبی حلقوں میں شہرت حاصل کی۔ قدیم دور میں عورت کو علم و ادب کی روشنی سے محروم رکھا جاتا تھا لیکن آج وہی عورت اردو ادب کے اُفق پر چمکتی ہوئی نظر آتی ہے اور نئی نسل کو علم و ادب کے زیور سے آراستہ کر رہی ہے۔ ہمارے ناقدین نے مختلف اصناف کے حوالے سے خواتین قلمکاروں کی خدمات کا تذکرہ تو کیا ہے لیکن طنز و مزاح کے حوالے سے اُن کی خدمات کا ذکر شاذ و نادر ہی کیا جاتا ہے۔ اردو طنز و مزاح کے میدان میں قابل قدر خدمات انجام دینے والیوں تو بہت سی خواتین نظر آ رہی ہیں جن کا اس مضمون میں ذکر کرنا ممکن نہیں ہے لہٰذا یہاں چند نمائندہ خواتین کا ہی تذکرہ کیا جائے گا۔

شفیقہ فرحت ہندوستان کی پہلی ظرافت نگار خاتون ہیں جو 26 اگست 1931 میں ناگپور مہاراشٹر میں پیدا ہوئیں۔ آپ نے ناگپور یونیورسٹی سے بی اے، ایم اے اردو، ایم اے فارسی اور ڈپلومہ ان جرنلزم کیا۔ 1978 میں جیواجی یونیورسٹی گوالیار سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ شفیقہ فرحت نے 1950 سے لکھنا شروع کیا اور برصغیر کے مقتدر ادبی رسائل میں ان کی تحریریں شائع ہونی شروع ہوئیں۔ آپ کے انشائیوں کا پہلا مجموعہ ''لو آج ہم بھی'' کے عنوان سے مدھیہ پردیش اردو اکادمی نے 1981 میں شائع کیا۔ دوسرا مجموعہ ''رانگ نمبر'' اور تیسرا مجموعہ ''گول مال'' مکتبہ جامعہ دہلی نے بالترتیب 1986 اور 1988 میں شائع کیے۔ اس کے بعد آپ کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کے مجموعے ''چوں چوں بیگم 1988، ''ٹیڑھا قلم'' 2003، ''نیم چڑھے'' 2004ء اور خاکوں کا مجموعہ ''چہرے جانے انجانے'' 2005 میں منظر عام پر آئے۔ شفیقہ فرحت آزادی کے بعد ابھرنے والے انشائیہ نگاروں میں اہم مقام رکھتی ہیں۔ آپ کے انشائیوں میں طنز بھی ہے اور مزاح بھی اور خاص بات یہ ہے کہ آپ کے مزاح میں شگفتگی پائی جاتی ہے۔ شفیقہ فرحت نے جس دور میں طنز و مزاح نگاری کا آغاز کیا اس دور میں عورتوں کا طنز و مزاح نگار بن جانا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ شفیقہ فرحت کے والدین چونکہ آزاد خیال تھے، اس لیے انھوں نے اپنی بیٹی کی طنزیہ اور مزاحیہ تحریروں پر اعتراض نہیں کیا جو ان کے لیے حوصلہ افزائی کا ضامن بن گیا۔ شفیقہ فرحت نے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کالج کے زمانے سے ہی لکھنا شروع کیے۔ انھوں نے مزاح نگاری کو فیشن کے طور پر نہیں بلکہ ایک فن کے طور پر اختیار کیا۔ ان کے مزاحیہ اور طنزیہ مضامین کے چند اقتباسات ملاحظہ کیجیے:

''شروع شروع میں آدمی کرسی کو بناتا تھا مگر آج کرسی آدمی کو بناتی ہے اور بہت ممکن ہے زمانہ قدیم میں کرسی آدمی کے لیے بنائی گئی ہو۔ لیکن آج تو آدمی کرسی کے لیے بنایا جاتا ہے۔

(کرسی، مشمولہ انشائیہ اور انشائیے، ص: 291)

''عشق کے امتحانوں اور ستاروں سے آگے والے جہانوں میں بھی نمبروں کا سکّہ چلتا ہے۔ اور بڑے دھوم دھام سے چلتا ہے۔ صحیح نمبر لگ گیا تو خانہ آبادی ورنہ خانہ بربادی۔ !''

(رانگ نمبر، ص: 15)

''محفل میں بہت دیر سے زبان کی کرکٹ ہو رہی ہے۔ جملے اُچھالے جا رہے ہیں اور چوکے چھکے مارے جا رہے ہیں۔ اتفاقاً ایک گیند آپ کے سر سے قد آدم، اونچی چلی گئی۔ اسے پکڑنے کے لیے ہاتھ پیر نہ ماریے کہ زندگی کے کسی میدان میں چھوڑا ہوا کیچ لیا جا سکتا ہے اور نہ شکست کا اعتراف کیجئے کہ معاملہ ناک کا ہے۔'' (ایک تبسم)

''چند دن آپ مختلف اوقات میں بس اسٹاپ پر کھڑے رہیں تو آپ پوری طرح موسم پروف بن جائیں گے۔ کیونکہ شہر کا ہر اسٹاپ کچھ ایسی جگہ اور ایسے ڈھنگ سے بنا ہوتا ہے کہ گرمیوں میں سورج نکلنے سے ڈوبنے تک ہر وقت اس میں کسی نہ کسی زاویے سے دھوپ کا حملہ ہوتا رہتا ہے اور برسات میں پانی کا۔ ظاہر ہے کہ ان مردافگن قسم کے حملوں سے کون بچ سکتا ہے۔ شروع میں تو ایک آدھ بار آپ کو لگے گی۔ زکام ہوگا بخار آئے گا مگر کب تک۔ دھوپ میں تپتے تپتے اور پانی میں بھیگتے بھیگتے آپ میں وہ قوت پیدا ہو جائے گی کہ گھنٹوں تپتی دھوپ میں بٹھا دیجیے اور موسلا دھار پانی میں کھڑا کر دیجیے کیا مجال جو ایک چھینک بھی آ جائے یا سر میں درد بھی ہو جائے۔'' (تعریف اس خدا کی مشمولہ رانگ نمبر، ص: 49)

ڈاکٹر انیس سلطانہ 2 جولائی 1941 کو بھوپال میں پیدا ہوئی۔ والد کا نام جناب ریاض الدین تھا جو سرکاری ملازم کی حیثیت سے بھوپال میں مقیم تھے اور وہیں وفات پا گئے۔ انیس سلطانہ اپنے والدین کی پانچویں اولاد تھیں۔ کل چھ بھائی بہن تھے۔ ابتدائی تعلیم بھوپال سے ہی حاصل کی۔

1963 میں وکرم یونیورسٹی اجین سے ایم اے اردو کیا۔1968 میں فارسی سے ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد برکت اللہ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔ والد کا آبائی وطن آگرہ بستی تاج گنج تھا۔ انیس سلطانہ کی پرورش ننھیال میں ہوئی جو علم دوست گھرانا تھا۔ وہاں انھیں اچھی تربیت ملی۔ اپنی عملی زندگی کا آغاز سلطانیہ گرلس کالج سے کیا۔ اس کے بعد گرلس کالج اجین میں لیکچرر کی حیثیت سے ان کا تقرر عمل میں آیا اور بتیس سال ایم ایل بی گرلس کالج بھوپال میں اردو تدریس میں گزارے اور بحیثیت صدر شعبۂ اردو 2001 میں ریٹائرمنٹ لیا۔ زمانہ طالب علمی سے ہی انشائیہ نگاری کی طرف رجحان تھا اور یہی صنف ان کی ادبی شناخت بن گئی۔ شاعری اور تنقید نگاری میں بھی اُن کا نام سرفہرست ہے۔ انیس سلطانہ نے طنز و مزاح کو اپنا ہتھیار بنایا۔ وہ ایک سلیقہ مند طنز و مزاح نگار، ایک باریک بیں نقاد اور تجربہ کار استاد اور منجھی ہوئی شاعرہ ہیں۔ انیس سلطانہ کے مزاحیہ مضامین کے چند اقتباسات ملاحظہ کیجیے:

''مدت سے باورچی خانے میں ہم نے قدم رنجہ نہیں فرمایا تھا۔ آج جو دیکھا تو واقعی رنج ندامت جھیلنا پڑا۔ ہر گوشہ میں مکڑیوں کے جالے اور نوکروں کے ذریعہ بامشقت پھیلائے گئے برتنوں نے عجیب سماں باندھ رکھا تھا۔ ہم سے کہاں برداشت ہوتا تھا۔ آج کمر ہمت باندھی اور صفائی کا بیڑا اُٹھایا مگر کمر ہمت جو باندھی تھی اسے سیدھا کرنا زلفوں کے خم نکالنے سے زیادہ مشکل تھا۔''

(آداب نشت و برخاست، مشمولہ ماہنامہ شگوفہ ستمبر 2012)

''جس بیساکھی میں زیادہ فائدہ نظر آئے اسی کا سہارا لینا چاہیے۔ گرفت مضبوط اور رفتار بھی تیز۔ کچھ دن ایک جگہ رہے، جب دیکھا کہ آبلہ پائی میں اضافہ ہونے والا ہے، کسی اور پارٹی کا رُخ کر لیتے ہیں۔ بارہ برس کا انتظار آج کل کوئی نہیں کرتا۔۔۔ جنگ رُکنے کے بعد قیدیوں کے تبادلے ہوا کرتے ہیں۔ الیکشن کی جنگ سے پہلے تبادلے ہوتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں اہم لوگوں کو توڑ لیا جاتا ہے جو جتنے زیادہ لوگوں کو توڑتا ہے اس کی جیت یقینی ہوتی ہے۔''

(خموشی آرزو دارم، مشمولہ قصور معاف، انیس سلطانہ، ص:58

پروفیسر خورشید جہاں 17 جولائی 1947 کو جھارکھنڈ میں پیدا ہوئیں۔ خورشید جہاں کو انشائیہ نگاری اور تنقید نگاری سے کافی دلچسپی تھی۔ اُن کے پی ایچ ڈی مقالہ کا عنوان تھا ''اردو تنقید پر مغربی تنقید کے اثرات'' جو کتابی صورت میں منظر عام پر آچکا ہے اور ان کے اب تک دو ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ تحقیق و تنقید کے باوجود انھیں طنز و مزاح سے بھی گہری دلچسپی تھی۔ مختلف رسائل و جرائد میں اُن کے مضامین شائع ہوتے رہے جو ادبی حلقوں میں کافی زیادہ پسند کیے جاتے تھے اور وہی مضامین کتابی صورت میں ''ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا'' کے عنوان سے منظر عام پر آئے ہیں۔ جہاں تک خورشید جہاں کے انشائیوں کا تعلق ہے تو اس میں ان کی ذات کھل کر سامنے آتی ہے۔ دوسروں کو ہدف بنانے کے بجائے وہ خود کو ہدف بنا کر اپنی بات کو قاری کے سامنے رکھ دیتی ہیں۔ اپنی تحریروں کی طرح خورشید جہاں اپنی نجی محفلوں اور گفت و شنید معاملوں میں بھی اتنی ہی شگفتہ مزاج، شوخ، صاف گو اور بیباک ہیں۔ ظرافت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کا اصل مزا تو تب ہے جب مزاح نگار خود اپنے آپ پر ہنسے اور طنز نگار خود اپنی ذات کو نشانہ بنائے اور جہاں تک خورشید جہاں کے مضامین کا تعلق ہے تو یہ بات ان پر صادق آتی ہے۔ انھوں نے اپنے مضامین میں اپنی ذات کو، اپنے پیشے کو، اپنی بیماری کو، اپنی تنخواہ کو اور اپنی تدریس وغیرہ کو مزاح اور طنز کا نشانہ بنا کر ظرافت کا سامان مہیا کیا۔ خورشید جہاں نے اپنے مضمون ''اعجاز مئے'' میں امتحانات اور امتحان نظام کو دلچسپ انداز میں ہدف بنایا ہے۔ اسی طرح ''من کہ'' میں انھوں نے اس معزز پیشے کے حوالہ سے مسرت آمیز باتیں کی ہیں جسے تدریس کہتے ہیں۔ خورشید جہاں نے عام زندگی کے بظاہر سیدھے سادے اور غیر اہم موضوعات پر قلم اُٹھایا ہے اور یہ ان کا کمال ہے کہ انھوں نے جانے پہچانے ماحول سے موضوعات اخذ کر کے قاری کے لیے مسرت کا سامان پیدا کیا۔ ان کے طنز و مزاح سے بھرپور مضامین کے چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیے:

''میرے ساتھ تو اور بھی زیادتی ہوئی تھی کہ دو دو سال میں ایک جماعت پاس ہونے دیا جاتا تھا جس سے میں تنگ آگئی تھی۔ آخر چند ہی برسوں میں بغیر مڈل پاس ہوئے گھر آبیٹھی۔ اتنے دنوں میں شادی کی عمر کو پہنچ چکی تھی۔ ماں باپ نے اچھا رشتہ دیکھ کر میری شادی کر دی۔ اس زمانے میں لڑکیوں کی شادی میں اتنی دقت نہ تھی۔ لڑکے اپنی بیوی کا تعلیم یافتہ ہونا ضروری نہ سمجھتے تھے بلکہ جاہل ہونا ہی لڑکیوں کے شریف اور سگھڑ ہونے کی دلیل تھا۔''

(''من کہ''، مشمولہ ہوئے کیوں نہ غرق دریا، ص:17-16)

تعلیم مکمل کرنے کے بعد اکثر لوگ نوکری کے چکر میں پڑ جاتے ہیں اور کچھ لوگ اپنا کاروبار شروع کرتے ہیں۔ اسی حوالے سے خورشید

جہاں نے اپنے مضمون ''میری قدر'' میں ایک تعلیم یافتہ نوجوان کے کپڑوں کا بزنس اختیار کرنے کو مزاحیہ وطنزیہ انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد کپڑوں کی دکان کھولتا ہے اور گاہکوں کو باقی دکانداروں کے مقابلے میں سستے داموں پر کپڑے دیتا ہے لیکن اس کے باوجود بھی گاہک وہاں نہیں جاتے۔ ایک دن وہ کسی کام کے سلسلے میں کہیں چلا جاتا ہے اور دکان میں کسی دوست کو بٹھاتا ہے اور جب واپس آتا ہے تو دیکھتا ہے کہ اس کے دوست نے کپڑے کے کئی تھان بیچ ڈالے تھے۔ اس کامیابی کا راز جاننے کے لیے انھوں نے جب دوست سے کہا تو انھوں نے خاموشی سے تماشا دیکھنے کو کہا جس کو خورشید جہاں نے اس انداز میں بیان کیا ہے:

''ایک گاہک آیا۔ ہمارے دوست نے اسے کم قیمت پر بہترین کپڑا دکھایا۔ گاہک نے اور اچھا کپڑا دکھانے کی فرمائش کی۔ دوست نے اسے اور کمتر کپڑا دکھایا۔ گاہک نے اور اچھا کپڑا دکھانے کی فرمائش کی۔ دوست نے اسے اور کمتر کپڑا دکھایا، قیمت اور زیادہ بتائی اور کپڑے کی تعریف میں زمین آسمان ایک کرنے لگا۔ گاہک نے اس سے بھی اچھا کپڑا مانگا۔ ہمارے دوست نے اور گھٹیا کپڑا دکھایا قیمت اور بڑھا دی۔ تعریف کے پل اور زور شور سے باندھنے لگا گاہک نے فوراً کپڑا پیک کروایا، قیمت ادا کی اور خوشی خوشی چلا گیا۔ اس کی انا کی تسکین ہوگئی۔''

(میری قدر، مشمولہ 'ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا'، ص:70)

ڈاکٹر فرزانہ فرح موجودہ دور کی ایک اہم طنز ومزاح نگار ہیں۔ بھٹکل کرناٹک سے تعلق رکھنے والی یہ خاتون شہرت وعظمت کی بلندیوں کو چھونے میں کامیاب نظر آرہی ہیں۔ وہ بیک وقت انشائیہ نگار، افسانہ نگار، طنز ومزاح نگار، شاعرہ، معلّمہ اور پرنسپل کی حیثیت سے جانی جاتی ہیں۔ ان کے انشائیوں کا مجموعہ منظر عام پر آچکا ہے اور ان کے طنزیہ ومزاحیہ مضامین ریاست اور بیرونِ ریاست کے مقتدر رسالوں اور اخباروں میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ موضوع کے جن گوشوں کو انھوں نے اپنے مضامین میں اجاگر کیا ہے وہ ان کے گہرے مشاہدے اور سماجی شعور کی پختگی کو ظاہر کرتے ہیں۔ اپنے مضامین میں بات سے بات پیدا کرنے کا ہنر انھیں خوب آتا ہے۔ ان کے مضامین میں لطافت کا عنصر خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔ ان کے مضامین پڑھ کر چہرے پر اُداسی یکسر ختم ہوجاتی ہے اور انسان زیرلب تبسم سے کھل اُٹھتا ہے۔ ان کے مضامین کے چند اقتباسات ملاحظہ کیجیے:

''ہیلمٹ سو بلاؤں کو ٹالتی ہے۔ ایک گرل فرینڈ کو گھمانے لے جائیں اور دوسری دیکھ لے تو بہانہ بنایا جاسکتا ہے۔۔۔ ''یار وہ تو آپا تھیں۔'' مقروضوں کی چاندی ہوگئی ہے۔ زن سے سامنے سے نکل گئے اور کوئی پہچانتا تک نہیں۔ اچکوں کو کسی کا پرس اڑانا ہو یا کسی کے گلے سے سونے کی چین چھیننی ہو تو آرام سے یہ کارنامہ انجام دے کے راہِ فرار اختیار کی جاسکتی ہے۔''

(آ کہ اب ہیلمٹ پہن لیں، مشمولہ ساحل آن لائن اردو نیوز، مارچ 2016)

''دھیرے دھیرے ہمارے تن و توش میں تبدیلی آنے لگی۔ پہلے ہم سری لنکا تھے۔ اس کے بعد رقبہ بڑھ کر ہندوستان بن گیا اور اب گمان غالب ہے کہ ماشاءاللہ ایشیا بن کر ہی دم لیں گے۔ چربی کی تہیں جسم پر یوں پھیلنے لگی ہیں جیسے ایسٹ انڈیا کمپنی نے ساری دنیا میں اپنی Colonies پھیلائی ہوں۔''

(ہم تو مائل بہ وزن ہیں، مشمولہ ماہنامہ شگوفہ، دسمبر 2013)

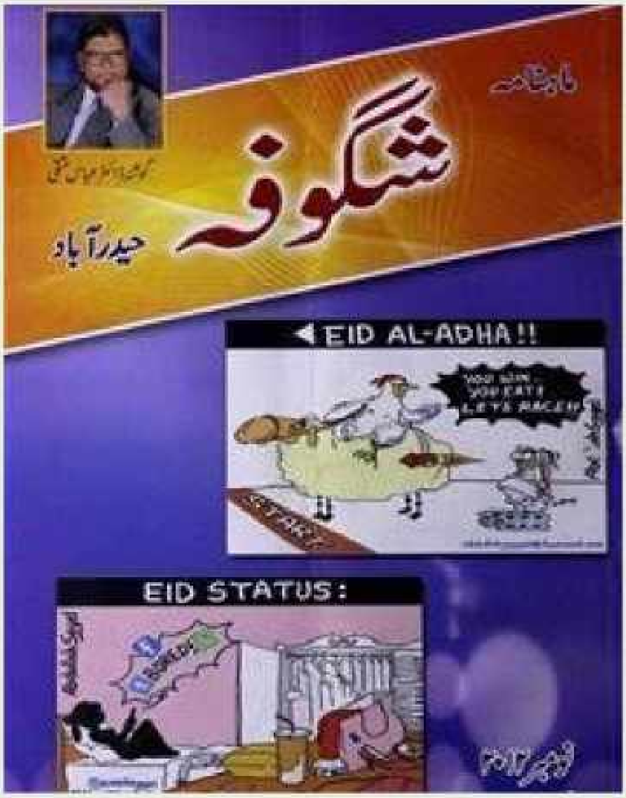

ڈاکٹر حلیمہ فردوس گلبرگہ میں پیدا ہوئیں اور بنگلور میں مقیم ہیں۔ انھوں نے دھارواڑ یونیورسٹی سے بی اے کیا۔ اس کے بعد 1995 میں میسور یونیورسٹی سے ایم۔اے۔ اسی یونیورسٹی میں انھوں نے ''شاذ، شخص اور شاعر'' کے عنوان سے اپنا تحقیقی مقالہ لکھ کر پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ 1974 سے 1976 تک وی۔ جی۔ ویمنس کالج گلبرگہ میں

بحیثیت لیکچرر کام کیا۔ 1976 سے ریاست کرناٹک کے مختلف سرکاری کالجوں میں درس وتدریس کے فرائض انجام دیے۔ فی الحال گورنمنٹ آر۔سی کالج بنگلور میں بحیثیت اسوسی ایٹ پروفیسر کام کر رہی ہیں۔ اردو انشائیہ نگاری اور طنز ومزاح نگاری سے اُن کو دلی لگاؤ ہے۔ ''رنگوں کے انتخاب نے'' اُن کا پہلا انشائیہ ہے جو ماہنامہ شاعر ممبئی نے شائع کیا ہے۔ اس کے بعد ان کے انشائیے ریاست کے مختلف ادبی رسائل وجرائد میں شائع ہوتے رہے۔ 1986 میں اُن کا پہلا مجموعہ ''ماشاء اللہ شائع ہوا جس

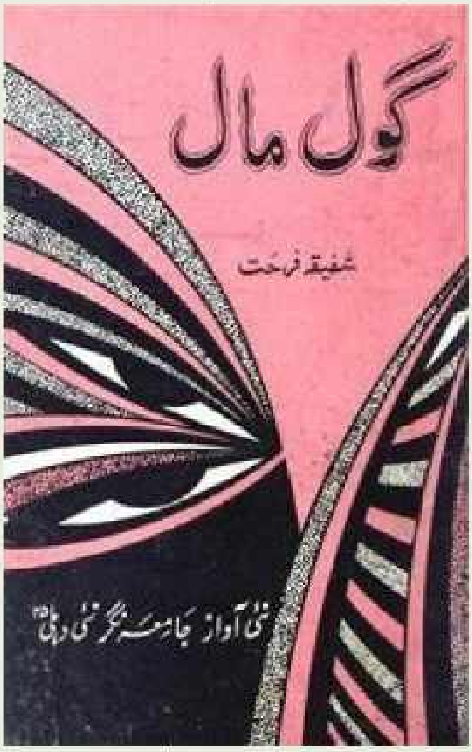

میں انشائیے اور طنزومزاح پر مضامین شامل ہیں۔ دوسرا مجموعہ ''بہر کیف'' 2002 میں منظر عام پر آیا۔ ڈاکٹر حلیمہ فردوس کے طنزیہ ومزاحیہ مضامین آج بھی مختلف رسائل وجرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں اور دیگر ادبی سرگرمیوں میں بھی وہ بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی ہیں۔ ڈاکٹر حلیمہ فردوس کے طنزیہ ومزاحیہ مضامین '' دعاؤں میں یاد رکھیے''، ''ہزاروں خواہشیں ایسی''، ایک رشوت خور استاد کی روداد وغیرہ قابل ذکر مضامین ہیں۔ دعاؤں میں یاد رکھیے'' کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> ''موبائل فون پر دن رات آنے والے مذہبی پیغامات (Messages) سے ہمارے Stress میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔ وضو، غسل اور نماز کے طریقوں سے متعلق بھیجے گئے مسیج پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ہمیں از سرِ نو مسلمان بنانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ کبھی کبھی دھمکی آمیز پیغام سے ہمارا ایمان ڈولنے لگتا ہے۔ اُن خوش نصیب بندوں کے کیا کہنے جنہیں خواب میں حضورؐ کا دیدار نصیب ہوتا ہے بلکہ ہم کلامی کا شرف بھی حاصل ہوتا ہے۔ اب یہ تو خدا جانے یا وہ جانے کہ یہ بندگانِ خدا کس زبان میں کلام کرتے ہیں، مگر ہم جیسے معصوم بندوں کو یہ حکم دیا جاتا ہے کہ حضورؐ نے خواب میں آکر فرمایا کہ نماز کے بعد ستر قُل پڑھئے اور یہ فرمان ستر مسلم بہن بھائیوں تک پہنچایئے ورنہ تباہی کا منہ دیکھنا پڑے گا۔''

(دعاؤں میں یاد رکھیے، ڈاکٹر حلیمہ فردوس، مشمولہ شگوفہ دسمبر 2010)

نسیمہ تراب الحسن کی پیدائش 1940 میں میرٹھ میں ہوئی۔ والد کا نام سید آفتاب حسین تھا۔ انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایل ایل بی کی۔ اس کے بعد میرٹھ میں وکالت شروع کی۔ نسیمہ تراب الحسن اُن کی تیسری اولاد تھیں۔ 1947ء کی جنگ آزادی کے بعد نسیمہ تراب الحسن کا خاندان حیدرآباد دکن کی طرف منتقل ہوا اور یہیں بس گیا۔ نسیمہ تراب الحسن نے گوشہ محل گرلز گورنمنٹ ہائی اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد گریجویشن کیا اور ایم اے میں بھی داخلہ لیا لیکن ادھورا چھوڑنا پڑا۔ اردو انہیں بزرگوں سے ورثے میں ملی تھی۔ اسکول کے زمانے سے لکھنے کا شوق تھا۔ نسیمہ تراب الحسن کا نام حیدرآباد کی خواتین انشائیہ نگار، طنزومزاح نگار اور مضمون نگار کی حیثیت سے لیا جاتا ہے۔ اُن کے مضامین اور انشائیے حیدرآباد اور دوسرے ریاستوں کے رسائل وجرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں جو اپنے منفرد اسلوب اور منفرد موضوعات کی وجہ سے کافی پسند کیے جاتے ہیں۔ ان کے مضامین ان کی شخصیت ہی کی طرح سیدھے سادھے ہیں۔ ان میں روزمرہ زندگی کی جھلکیاں صاف طور پر دکھائی دیتی ہیں۔ ان کے انشائیے اور مضامین زندگی میں پیش آنے والے مسائل کی ترجمانی کرتے ہیں۔ نسیمہ تراب الحسن اپنے مضامین اور انشائیوں میں طنز اور مزاح کا استعمال فنکارانہ انداز میں کرتی ہیں۔ ان کے طنزیہ ومزاحیہ مضامین اور انشائیوں میں غلط فہمی، بن ڈھونڈے ہزار ملتے ہیں، ہم کو عبث بدنام کیا وغیرہ کافی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔

□□□

Bilal Ahmad Dar
(Ph.D Research Scholar)
Department of Urdu,
Maulana Azad National Urdu University
Gachibowli Hyderabad- 500032 (T.S)

سوشل میڈیا اور نصف آبادی کے مسائل

محمد علم اللہ

مواصلاتی انقلاب کے اس دور میں سوشل میڈیا ایک مضبوط ستون کے طور پر ابھرا ہے۔ تکنیکی ترقی کے ساتھ ساتھ سوشل میڈیا روز بہ روز مقبولیت کی بلندیوں کی جانب گامزن ہے۔ سیاست سے لے کر تجارت، عام آدمی سے لے کر معروف شخصیات، ادب سے لے کر صحافت، سماجی کارکنان سے لے کر حکومت تک سب ہی نے سوشل میڈیا کو جزو لاینفک کے طور پر اختیار کیا ہے۔ آج سوشل میڈیا سماجی زندگی کا آئینہ بن چکا ہے۔ تمام سوشل سائٹس صرف تفریح اور اجتماعیت نبھانے تک ہی محدود نہیں، بلکہ انقلاب تک کا ہتھیار بن چکی ہیں۔ بات سیاست کی ہو یا کھیل کی دنیا کی، بدعنوانی کی ہو یا مہنگائی کی، ہر ایشو کو لے کر وقتاً فوقتاً عوام اور سرکار نے سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس کے ذریعے بڑی ہی بے باکی سے اپنا موقف پیش کیا ہے۔ سوشل میڈیا بدعنوانی کے خلاف بھی ایک اہم ذریعے کے طور پر ابھرا ہے۔ اس کے ذریعے سے لوگوں کے قریب جانا، علم میں اضافہ کرنا، ملک اور دنیا سے وابستہ رہنا بہتر طریقے سے ہوتا ہے۔ سوشل میڈیا سیاسی قیادت اور عوام کو قریب لانے اور بہتر طریقے سے رابطہ و مکالمہ کرنے میں بھی موثر ثابت ہوا ہے۔

گلوبلائزیشن اور لبرلائزیشن اقتصادی نظام ہمارے گھروں پر دستک دے رہا ہے۔ اس سے منھ موڑ کر رہنا ممکن نہیں ہے۔ آج سوشل میڈیا، گلوبل حقائق کو ظاہر کرنے کا زبردست ذریعہ بن چکا ہے۔ لہٰذا اس نے سماج کے مختلف طبقوں کو الگ الگ روپ میں متاثر کیا ہے۔ سوشل میڈیا سے ہر شعبے میں نئی بے داری اور نیا انقلاب آیا ہے۔ سوشل نیٹ ورکنگ نے عالمی منظرنامے پر اظہار خیال کی آزادی کا جدید ترین ہتھیار دے کر ہمارے خیالات کے آسمان کو لامتناہی بنا دیا ہے۔ پہلے جس آن لائن دنیا کو فنطیسی اور تکنیکی تصور کی دنیا مانا جاتا تھا، اب وہ زندہ جاوید اور ایک دوسرے سے گفتگو کرنے والی دنیا کے طور پر فروغ پا رہی ہے۔ خاص طور پر جب حساتی نیٹ ورکنگ کی دنیا ہماری انگلیوں پر موجود ہے۔

مختلف مصنوعات کی لانچنگ اور ان کی مہمات میں حصہ لینے کے ساتھ ساتھ سوشل میڈیا اخبارات ورسائل اور کتابوں کے اجرا کا ایک اہم ذریعہ بن چکا ہے۔ بے باک اظہار خیال کے طور پر سوشل میڈیا ایک ایسا تیر بہ ہدف نسخہ بن چکا ہے، جس کا مثبت استعمال کرنے پر سماج کو نیا رخ دیا جا سکتا ہے۔ اس نے ایک طرف 'اطلاعات کو جمہوری قالب میں ڈھالنے' کو بڑھاوا دیا ہے، وہیں سوشل میڈیا کے ذریعے سماجی برتاؤ اور گفتگو کے طور طریقے بھی تبدیل ہوتے نظر آرہے ہیں۔

موجودہ دور میں سوشل میڈیا کا اہم کردار ہے۔ نیٹ ورکنگ آج کا سب سے زیادہ مروجہ لفظ ہے۔ سوشل میڈیا کی تعریف میں کہا گیا ہے کہ "یہ انٹرنیٹ پر مبنی 'نئے تجربات' کا ایک ایسا گروپ ہے جو یوزرس کے تیار کردہ مواد کو سنوارنے اور اس کے تبادلے کی اجازت دیتا ہے۔" یہ ایک ایسی

حیاتی دنیا کی تعمیر کرتا ہے، جہاں فرد حقیقی طور پر موجود نہ رہ کر بھی اپنی آواز بلند کر سکتا ہے۔ سوشل میڈیا نیٹ ورک نے اظہار خیال کی آزادی کی شکل تبدیل کی ہے۔ لیپ ٹاپ، ٹیبلیٹ، موبائل فون، اسمارٹ فون اور آئی پیڈس نے اسے اور بھی سہل الحصول بنا دیا ہے۔ فیس بک، ٹوئیٹر، گوگل پلس، لنک ڈن، مائی اسپیس جیسی سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس کا داخلی جال فرد کے فکر وشعور، نقطۂ نظر، نظریات اور اجتماعیت کو نئی جہت عطا کر رہا ہے۔ ہندستان میں سوشل میڈیا کا استعمال کرنے والوں کی تعداد زائد از 19.1 کروڑ ہے۔ ان میں 64 فی صد یوزرس 8 میٹرو شہروں میں، 24 فی صد یوزرس 2 لاکھ سے کم آبادی والے قصبات میں اور 11 فی صد یوزرس دیگر چھوٹے قصبوں میں ہیں۔ سوشل سائٹس میں بھی 'فیس بک' سب سے اہم ویب سائٹ ہے۔ عالمی پیمانے پر ہندستان امریکا کے بعد فیس بک کا دوسرا سب سے بڑا بازار بن گیا ہے۔ ہندستان میں مارچ 2016 تک فیس بک یوزرس کی تعداد 14.2 کروڑ تھی۔ اس میں روزانہ کی بنیاد پر بات کریں تو ہندستان میں 6.9 کروڑ یوزرس فیس بک کا ہر روز استعمال کرتے ہیں اور ان میں سے 64 فی صد یوزرس موبائل کے ذریعے فیس بک تک پہنچتے ہیں۔

انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا نے آزادی نسواں اور ویمن امپاورمنٹ کو بھی نیا مقام عطا کیا ہے۔ ویمن امپاورمنٹ صرف ایک غیر مرئی تصور نہیں ہے، بلکہ اس کا مطلب ہے کہ خواتین سے متعلق تمام معلومات کے لیے ان کی لیاقت ومہارت میں اضافہ کر کے سماجی اور ادارہ جاتی رکاوٹوں کو دور کرنے کا موقع فراہم کرنا، ساتھ ہی مالی وسیاسی سرگرمیوں میں حصہ داریوں کو بڑھاوا دینا، تاکہ وہ اپنے معیار زندگی میں غیر معمولی تبدیلی واصلاح کر سکیں۔ انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا کا کینوس بہت وسیع ہے اور اس سے گزرتے ہوئے عورت ذات کے تئیں چلے آ رہے ہزاروں سال کے تصورات کو ترک کرنا پڑتا ہے۔ عورت کے دل میں آج بھی اضطراب ہے، کسک ہے اور کچھ کرنے کا جذبہ ہے۔ یہ جدوجہد خود کو ثابت کرنے کی ہے۔ بس ضرورت محض ایک ذریعے کی ہے۔ انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا نے گھر بیٹھے انھیں یہ میڈیم فراہم کرا دیا ہے۔ یہ ان کی آزادی کی جدوجہد ہے، جہاں کوئی روک ٹوک نہیں۔ یہاں خواتین بے داری کا ماضی، حال اور مستقبل کا سنگم بہت زیادہ تیز وتند ہے۔ ایسے میں سوشل میڈیا تحریک نسواں، ویمن امپاورمنٹ اور آزادی نسواں کو بڑھاوا دینا، تاکہ وہ اپنے معیار زندگی میں غیر معمولی تبدیلی واصلاح کر سکیں۔

ٹرائی کی رپورٹ کے مطابق ہندستان میں دسمبر 2016 تک تقریباً 39.15 کروڑ لوگ انٹرنیٹ کا استعمال کر رہے تھے۔ ان میں شہری علاقوں میں 27.64 کروڑ اور دیہی علاقوں میں 11.51 کروڑ یوزرس شامل ہیں۔ گوگل انڈیا کی جانب سے کیے گئے خواتین اور ویب اسٹڈی کے مطابق ان میں سے 30 فی صد خواتین ہیں۔ ان میں شہری علاقوں میں انٹرنیٹ یوزرس میں 48 فیصد مرد اور 27 فیصد خواتین ہیں، جب کہ دیہی علاقوں میں یہ بالترتیب 35 اور 12 فیصد ہے۔ انٹرنیٹ اینڈ موبائل ایسوسی ایشن آف انڈیا کی رپورٹ کے مطابق اسمارٹ فون پر انٹرنیٹ استعمال کرنے کے بڑھتے رواج کی وجہ سے 2017 کے آخر تک اس سے بڑھ کر 50 کروڑ سے زیادہ ہونے کی امید ہے۔ ہندوستان میں ویمن امپاورمنٹ میں اہم کردار ادا کر کے انٹرنیٹ ان کی زندگی کو نیا رخ دے سکتا ہے۔ خواتین میں موبائل پر انٹرنیٹ کے استعمال کا چلن بڑھ رہا ہے۔ سنہ 2013 میں صرف 20 فیصد خواتین انٹرنیٹ کا استعمال کرتی تھیں، لیکن اکتوبر 2015 تک یہ عدد 30 فیصد تک پہنچ گیا۔ یہ سبھی اپنے روزمرہ کی زندگی میں انٹرنیٹ کا استعمال کرتی ہیں اور اپنے کام کو پورا کرنے کے لیے آن لائن رہتی ہیں۔ اسٹڈی کے مطابق انٹرنیٹ پر ہندوستانی خواتین سب سے زیادہ ہیں۔ اس کے علاوہ کھانے پینے، بچوں کی دیکھ بھال، بال سنوارنے اور جلد نرم وملائم رکھنے کے طریقے تلاش کرتی ہیں۔ انٹرنیٹ سے ہندوستانی خواتین کے بااختیار ہونے میں اضافہ ہوا ہے اور معلومات تک ان کی رسائی ہوئی ہے۔ وہ روزانہ کی زندگی کے بارے میں صحیح اور وسیع پہلو سے فیصلے لے پا رہی ہیں۔ انٹرنیٹ پر سوشل میڈیا کا استعمال بھی خواتین کھل کر کر رہی ہیں۔ اس کے ذریعے وہ ان تمام پہلوؤں پر سوال پوچھ رہی ہیں، جنھیں اب تک موضوعِ گفتگو نہیں بنایا گیا۔ پارلیمانی انتخابات کے دوران خواتین کی تنظیم 'فکّی' سے خطاب کرتے ہوئے موجودہ وزیر اعظم اور گجرات کے اس وقت کے وزیر اعلیٰ نریندر مودی نے بھی قبول کیا تھا کہ سوشل میڈیا کے ذریعے خواتین نے ان سے سوال پوچھے تھے اور بہت سی تجاویز بھی پیش کی تھیں۔ انھوں نے کہا کہ اس کی وجہ سے انھیں ایشوز کو سمجھنے اور ان پر تقریر تیار کرنے میں کافی سہولت ہوئی۔

انٹرنیٹ کی رسائی ہر جگہ بڑھی ہے۔ گھر، سائبر کیفے اور دفاتر میں انٹرنیٹ کا استعمال بڑھ رہا ہے۔ اس کے علاوہ موبائل فون پر بھی انٹرنیٹ کا استعمال ہوتا ہے۔ ان کا استعمال خواتین کے ذریعے کئی دفعہ صحیح اور من پسند پروڈکٹ کا انتخاب کرنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ خواتین کے آن لائن آنے سے ایک بہت بڑا مثبت اثر ان کی زندگی، ان کی حالت اور ساتھ ہی سماج پر ہوتا ہے۔ انٹرنیٹ استعمال کرنے والی

خواتین نسبتاً جوان اور خود کفیل ہیں۔ حالاں کہ خواتین کے سامنے انٹرنیٹ استعمال کرنے میں عملی مسائل آتے ہیں۔ مثلاً گھروں میں نیٹ ورک کا مسئلہ، گھر کے کام کے ساتھ ساتھ افرادِ خانہ کو وقت دینا اور پھر وقت ملا تو نیٹ پر بیٹھنا ممکن ہو پاتا ہے۔ آن لائن آنے میں خواتین کے آگے تین اہم رکاوٹیں ہیں—رسائی، علم اور بے داری۔ اقوام متحدہ کی براڈ بینڈ سروس کمیشن کے مطابق انٹرنیٹ سروسز کے معاملے میں خواتین کی صورت حال مردوں کے مقابلے میں زیادہ خراب ہے۔ ترقی پذیر ممالک میں ایسی خدمات سے وابستہ خواتین کی تعداد مردوں کے مقابلے میں 25 فیصد کم ہے۔ اسی سمت میں انٹرنیٹ کا استعمال کر کے خواتین کو بااختیار بنانے کے لیے گوگل نے 'ہیلپنگ ویمن گیٹ آن لائن' نام سے ایک کوشش شروع کی تھی، اس کے تحت 2014 کے آخر تک مزید 5 کروڑ خواتین کو انٹرنیٹ سے منسلک کرنے کا ہدف رکھا گیا تھا۔ ایسی کوششوں سے خواتین کو 'انٹرنیٹ فرینڈلی' ہونے میں آسانی ہوتی ہے، یعنی ان کے لیے انٹرنیٹ کا استعمال آسان ہو جاتا ہے۔

سوشل میڈیا نصف آبادی کے لیے ایک تیر بہدف نسخے کی شکل میں سامنے آیا ہے۔ اس نے خواتین کو کھل کر اپنی بات رکھنے کا وسیع پلیٹ فارم مہیا کیا ہے۔ یہاں شوخی و شرارت ہے تو سنجیدگی بھی پائی جاتی ہے۔ خواتین کی تعلیم، کیریئر، صحت، قتل جنین، جنسی استحصال، گھریلو تشدد، کام کی جگہوں پر جنسی مظالم، جہیز، موسیقی، علم نجوم، مذہبی عقائد سے لے کر سیاسی و سماجی تناظر، مہنگائی، ماحولیات وغیرہ جیسے تمام امور زیر بحث آتے ہیں۔ یہاں پر بے باکی ہے تو حدود کا احساس کراتی اخلاقیات بھی ہے۔ سوشل میڈیا کے اسٹیٹس میں نہ جانے کتنے سوالات کا شور پوشیدہ ہے۔ یہاں وقت کے بطن میں نہ جانے کتنی سیتا، ساوتری، دروپدی، انوسویا، گارگی اور نربھیا اپنا مہابھارت خود ہی لکھ رہی ہیں۔ یہاں ویدک ہندوستان کی خواتین بے داری سے لے کر میرابائی اور مہاشویتا دیوی تک کو سمجھنے اور گفتگو کرنے کا راستہ موجود ہے۔ دل کے کوزے میں پوشیدہ متعدد سمندر اور آزادی کی جدوجہد سوشل میڈیا کے ذریعے سے بخوبی سامنے آرہی ہے۔ گھریلو ایشوز سے لے کر سماجی اور سیاسی ایشوز پر بے باکی سے کی بورڈ پر انگلیاں تھرک رہی ہیں۔ کئی سوشل میڈیا ایکٹیوسٹ اس پلیٹ فارم کے ذریعے سے اپنی الگ شناخت قائم کر رہی ہیں۔ گھر میں رہنے والی خواتین سوشل میڈیا کو ایک ایسے پلیٹ فارم کی شکل میں استعمال کر رہی ہیں، جہاں مختلف انداز میں ان کے خیالات کا اظہار ہو رہا ہے۔ نظم، گیت، غزل، ہائیکو، کشنیکا، انو کانت کویتائیں، مختصر افسانے، کہانی، مضامین، یادیں، سفرنامے، سبق آموز واقعات، کتابوں پر تبصروں سے لے کر تمام معروف پہلوؤں سے خواتین سوشل سائٹس کو رونق بخش رہی ہیں۔ یہاں دلِ نسواں کا نوحہ ہے تو وہیں رسموں اور روایات کو عبور کرتا ہوا چیلنج بھی ہے۔

تبادلۂ خیالات سے لے کر مذاکرات و مباحث تک موضوع خواتین سوشل میڈیا کے ذریعے وسیع ہو رہا ہے۔ ہندوستان میں صرف فیس بک سے ابھی 30 فی صد خواتین جڑی ہوئی ہیں۔ اب تک گھروں اور کنبوں کے دائرے میں رہنے والی خواتین یہاں اپنی صلاحیت کا مظاہرہ کرنے اور شناخت بنانے کو تیار نظر آتی ہیں۔ تب ہی تو خواتین گھر میں گھریلو کاموں کے ساتھ ساتھ اپنے دل و دماغ میں اس پر بھی غور وفکر کر رہی ہوتی ہیں کہ آج وہ کس ایشو کو لے کر سوشل سائٹس پر لکھیں گی؟ جن موضوعات کو لے کر گھر اور معاشرے میں بولنے کی بندشیں ہیں، وہ سوشل سائٹس پر کھل کر شیئر کیے جا رہے ہیں اور ان پر اچھی خاصی بحث بھی ہو رہی ہے۔ یہاں تک کہ سوشل میڈیا کے معاملے میں گھریلو خواتین ملازمت پیشہ خواتین سے زیادہ سرگرم ہیں۔ سوشل میڈیا کے استعمال کے معاملے میں جہاں گھریلو خواتین کی تعداد 55 فیصد ہے، وہیں ملازمت پیشہ خواتین 52 فیصد ہیں۔ تجربات اور آپ بیتی کو شیئر کرنے سے شخصیت کے کتنے خوش گوار پہلو سامنے آسکتے ہیں، آگے بڑھنے کا کس قدر عزم و حوصلہ جاگ سکتا ہے، سوشل میڈیا اس کی زندہ مثال ہے۔

فیس بک پر خواتین کی بڑھتی حصے داری ہی کا اثر ہے کہ مرکزی وزارت برائے خواتین و اطفال نے 2015 میں فیس بک کے ساتھ 'روپے 100 مہیلائیں پہل' شروع کی۔ اس کے تحت لوگ کسی بھی ایسی عورت کو نامزد کر سکتے تھے، جس نے سماج پر گہرا اثر ڈالا ہو اور معاشرے میں اہم شخصیت کے طور پر ابھری ہو۔ فیس بک پر نہ صرف خواتین کی حصہ داری بڑھی ہے، بلکہ فیس بک بھی خواتین کے تئیں سنجیدہ ہوا ہے۔ فیس بک کے فرینڈز آئیکن میں آگے مرد کی تصویر ہوتی تھی اور پیچھے خاتون کی۔ اس کی وجہ سے مرد کے مقابلے عورت کا آئیکن تھوڑا چھوٹا بھی تھا۔ فیس بک نے 2015 میں اس میں تبدیلی کر کے عورت کو آگے اور مرد کو پیچھے کر دیا ہے۔

مائیکرو بلاگنگ سائٹ ٹوئیٹر نے بھی اعلان کیا کہ وہ 2016 سے خواتین کو زیادہ ملازمت دے گا۔ اس کا مقصد خواتین اور مردوں کے درمیان فرق کو ختم کرنا ہے۔ اس کے تحت ٹیکنیکل جاب میں خواتین کی حصے داری 22 سے بڑھا کر 25 فیصد کی جائے گی۔ غور طلب ہے کہ موجودہ وقت میں دنیا بھر میں ٹوئیٹر کے 4100 کارکنان ہیں، جن میں صرف خواتین کی تعداد 1400 ہے۔ بلاشبہ ان سب سے ایک مثبت پیغام جاتا ہے۔

سوشل میڈیا کے مثبت اور منفی دونوں پہلو ہیں۔ تمام منفی لوگ بھی سوشل میڈیا سے منسلک ہو رہے ہیں۔ کئی مرتبہ خواتین کے نام سے فرضی پروفائل بنا کر بھی غلط استعمال کیا جاتا ہے۔ فرضی ناموں سے بڑھتے ردِ عمل اور الزامات اور جوابی الزامات کی وجہ سے بھی کئی مرتبہ خواتین کو مشکل صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بعض اوقات کچھ لوگ خواتین کی آزادی کو برداشت نہیں کر پاتے اور سوشل میڈیا میں اناپ شناپ تبصرے بھی کرتے نظر آتے ہیں۔ اقوام متحدہ کی ایک رپورٹ میں 73 فی صد یعنی انٹرنیٹ و سوشل میڈیا پر سرگرم دنیا کی تقریباً تین چوتھائی خواتین نے تسلیم کیا ہے کہ ان کے ساتھ آن لائن چھیڑ چھاڑ ہوئی ہے۔ 66 فیصد لڑکیوں نے تسلیم کیا کہ ان کے ساتھ فیس بک پر چھیڑ چھاڑ ہوئی ہے۔ 46.7 فی صد خواتین نے مانا ہے کہ انٹرنیٹ پر وہ بیہودہ تبصرے برداشت کر چکی ہیں، لیکن انھوں نے اسے نظر انداز کر دیا۔ 35 فی صد خواتین ہی نے سائبر چھیڑ چھاڑ کی شکایت درج کرائی۔ 86 ملکوں میں صرف 26 فی صد ایسے معاملوں میں قانونی کارروائی ہوتی ہے۔ تمل ناڈو کے ترونیلولی میں کرمنالوجی کے پروفیسر ڈاکٹر جے شنکر اور وکیل دیبرتی ہلدر نے انٹرنیٹ پر حملوں میں خواتین کو نشانہ بنائے جانے پر تحقیق کر کے 'کرائم اینڈ دی وکٹیمائزیشن آف ویمن' Crime and the victimization of women کے عنوان سے کتاب لکھی ہے۔ اس میں انھوں نے صاف طور سے لکھا ہے کہ "ہمارے سماج کی مرد پرستانہ ذہنیت انٹرنیٹ پر بھی جھلکتی ہے، خواتین بحث کریں یا جواب دیں، یہ مردوں کو پسند نہیں۔ معروف ہستیوں کو غیر شائستہ زبان سے نشانہ بنایا جاتا ہے اور عام عورتوں کا پیچھا کر کے ان سے اصل زندگی میں رابطہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔" ایسی صورت میں سوشل میڈیا کا استعمال سنبھل کر کرنے ہی میں سمجھداری ہے۔

آج سوشل میڈیا روایتی میڈیا نہ ہو کر صرف ایک متبادل بن چکا ہے، بلکہ 'شہری صحافی' کا کردار بھی نبھا رہا ہے۔ لہٰذا سوشل میڈیا پر ایسی باتوں کا، جو عورت کے خلاف ہیں، اسی انداز میں جواب بھی دیا جا رہا ہے۔ کبھی کبھی تو سوشل میڈیا پر خواتین کی جانب سے لکھی گئی پوسٹ اس کھڑکی کی طرح نظر آتی ہے جہاں ہم پورے سماج کا عکس دیکھ سکتے ہیں۔ سوشل میڈیا میں خواتین کی آواز اور تخلیقات سوالات کی بوچھار کرتی نظر آتی ہیں۔ وہ ہر قاری کے ذہن و دل میں سوال پیدا کرتی ہیں اور سوچنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ خواتین کے لیے الم غلم لکھنے اور انھیں روایتی اور دقیانوسی بندشوں میں قید کرنے کے حامی خیالات پر خواتین اپنا فکری انتقام بھی درج کرا رہی ہیں۔ اب وہ بولنے سے اور آواز اٹھانے سے قطعی نہیں جھجکتیں۔ اپنے ذاتی پروفائل کے ساتھ تمام گروپ و پیجوں پر بھی خواتین اپنی مضبوط موجودگی درج کرا رہی ہیں۔ اکثر و بیشتر ان اسٹیٹس میں وہ اپنی باتوں کو ایسے پیش کرتی ہیں کہ قارئین بھی حیران ہو جاتے ہیں۔ اپنے قلم کے ذریعے وہ جہاں تمام ایشوز کو جگہ دے رہی ہیں، وہیں 21 ویں صدی میں خواتین کی نمائندگی کو بھی نمایاں کر رہی ہیں۔ ان کی تخلیقات میں خواتین کی داستانِ الم سے لے کر حصولیابیوں اور سرگزشتوں تک ایک طویل فہرست ہے، جو سماج میں خواتین کو ظلم و استحصال کے خلاف آواز اٹھانے کے لیے ترغیب دیتی ہے۔ سوشل میڈیا کی دنیا پوری طرح آزاد، خود مختار اور آزادانہ اظہار خیال کی دنیا ہے۔ نہ دقیانوسی بندشیں، نہ وقت کی قید اور نہ دوری کا جھنجھٹ، بس ایک کلک کی ضرورت ہے۔ یہاں تصور، فکری گہرائی اور باہمی حساسیت کے ساتھ رچ بس کر جو بصیرت پیدا کی جاتی ہے، وہ کئی مرتبہ زندگی کو لافانی بنانے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ ایسے میں سوشل میڈیا کے ذریعے آزادیِ نسواں اور ویمن امپاورمنٹ کو بھی نئی جہتیں ملی ہیں۔

□□□

Mohd Alamullah
Research Scholar
K R Narayanan Centre for Dalit & Minority studies,
Jamia Millia Islamia University
New Delhi-110025

ڈاکٹر شہناز یوسف

بوڑھی کاکی

میں جانتی ہوں کہ بوڑھی کاکی کا نام سن کر آپ کے ذہن میں برسوں پرانی پریم چند کی کہانی ''بوڑھی کاکی'' کا تصور اُبھر کر سامنے آ گیا ہوگا جو بے بس اور بے زبان تھی۔ جس کی زندگی میں سوائے ذائقہ کی حس کے اور کچھ باقی نہیں رہا تھا۔ جس نے ایک پوری کھانے کے لیے کئی ذلتیں سہی تھیں۔ لیکن یہاں معاملہ برعکس ہے۔

ہمارے گھر کی ''کاکی'' یعنی میری دادی ماں جنھیں گھر کے بڑے، چھوٹے اور یہاں تک کہ بچے بھی ''کاکی'' ہی کہہ کر پکارتے ہیں، اُن میں دور دور تک وہ خصوصیات نہیں تھیں جس کی توقع آپ گھر کے کسی بزرگ سے کرتے ہیں۔ کاکی صرف عمر اور سفید بالوں کے لحاظ سے بزرگ تھی ورنہ اُن کی تمام حرکتیں ایک کم سن لڑکی کی مانند تھیں۔ کپڑوں کی بے حد شوقین۔ ایک بار کوئی جوڑا پہن لیتی تو دوسری مرتبہ مہینوں بعد اُس کا نمبر آتا۔ لمبا قد اور اُجلا سفید رنگ کاکی پر ہر لباس کی چمک کو دوگنا کر دیتا۔ ہاتھوں میں رنگین چوڑیوں کے ساتھ ساتھ سونے کے دو کنگن، گلے اور کان میں سونے کے زیور پہنی کاکی کو دیکھ کر ہر کوئی رشک کرتا۔ کاکی بھی نمائش کا کوئی موقع نہیں جانے دیتیں۔

روپیوں کی پرواہ کیے بغیر خرچ کرتیں۔ دراصل دادا مرحوم نے گھر کا ایک حصّہ کرائے پر دینے کی غرض سے تعمیر کروایا تھا تاکہ کچھ آمدنی ہوتی رہے اور بیٹوں کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی نوبت نہ آئے۔ کاکی نے کئی سالوں سے ملنے والے مکان کے کرائے کی اس رقم کو کبھی سنبھال کر رکھنا ضروری نہیں سمجھا۔ اس عمر میں بھی تفریح کا اس قدر شوق کہ ایک سفر سے لوٹنے سے قبل دوسرے کے لیے تیار رہتیں اور ساری رقم برابر کر کے ہی دم لیتیں۔ کسی ایک جگہ پر ٹک کر رہ جانا اُن کے لیے ناممکن تھا۔ جتنی تیز رفتار کے ساتھ چلتی تھیں اُتنی ہی خاموشی کے ساتھ بغیر ہلے سوتیں۔ ہر ایک بات پر دادا سے بحث کرنا اور آخر میں پورا گھر سر پر اُٹھا لینا کاکی کے روزمرہ کے کاموں میں شامل تھا۔

دادا مرحوم جب اپنی زندگی کے آخری مرحلے کی طرف بڑھ رہے تھے جہاں جسمانی عضو کے ساتھ ساتھ اُن کا ذہنی توازن بھی بگڑ چکا تھا اُس وقت بھی ہماری کاکی اپنے مائکے جا کر بیٹھ گئیں تھیں۔ اس عمر میں بھی روٹھ کر اپنے بھائی کے پاس چلے جانا اُن کے لیے عام بات تھی۔ یہ تو اللہ کا فضل ہے کہ دادا مرحوم کی گیارہ اولادیں تھیں جن میں آٹھ بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں لہٰذا اپنی رفیقِ حیات کے یوں ضرورت کے وقت چلے جانے پر بھی اُن کی تیمارداری کے لیے خاصی تعداد میں گھر کے افراد موجود تھے۔ جب دادا حضور کی طبیعت زیادہ بگڑی اور وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھے تب ہماری کاکی چھاتی پیٹتی ہوئی اپنی محبت کا مظاہرہ کرنے کی خاطر دوڑی آئیں۔ آنکھیں رو رو کر اس قدر سجا لیں کہ جیسے کوئی اپنے محبوب کی یاد میں تڑپ تڑپ کر سارے ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے۔ پھر جب دادا مرحوم اس دنیائے

فانی سے رخصت ہوگئے تو اللہ اللہ۔ کیا ماتم کیا گیا۔ دوپٹہ جسم سے کوسوں دور ہوگیا۔ سر کے بال نوچ گئے۔ ایسی چیخیں فضا میں بلند ہوئیں کہ سارے بیٹے جنازہ چھوڑ کر کاکی کو دلاسہ دینے کی خاطر دوڑے آئے اور پھر جو راگ کے ساتھ رو رو کر دادا کی خوبیاں اور اپنے سہاگ کے اُجڑ جانے کا غم منایا گیا، پوچھیے مت۔ ہماری کاکی آہ و بکا میں اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتیں۔

کاکی رونے میں جتنی ماہر تھی اتنی ہی لاجواب گالیاں بھی دیا کرتیں۔

لیکن کاکی کا اصل ہنر تو اُس وقت ہمارے سامنے آیا جب میری خالہ زاد بہن کی شادی ہوئی۔ جیسا کہ ہماری ہندوستانی روایت رہی ہے کہ بارات کی آمد پر مرد اور عورتیں اپنے رشتہ داروں کو بدھانے یعنی اُن کا استقبال کرنے کے لیے دروازے پر کھڑے ہوتے ہیں۔ وہیں ہم نئی نسل اس بات سے انجان تھے کہ راجستھان کے گاؤں میں یہ رواج رہا ہے کہ دولہا دولہن کے خاندان کی عورتیں ایک دوسرے کو گالیاں دے کر اور فحش باتیں کرتے ہوئے خوش آمدید کہتی ہیں۔ چونکہ ہمارے خاندان میں یہ پہلا موقع تھا لہٰذا پہلی دفع جب ہم نے اس روایت کو اور کاکی کو غیر معقول حرکتیں کرتے اور گالیوں اور فحش الفاظ کے استعمال کے ساتھ تالیاں بجا بجا کر اپنی رشتہ داروں کو چھیڑتے دیکھا تو ہم تمام بہنیں متحیر رہ گئیں۔ کاکی پورے راگ اور اشاروں کے ساتھ گیت گا رہی تھیں۔۔۔۔

ایسی دیئو لات کی ڈھس جاوے پیٹ
نکل جاوے چیومیوپولی جیسو پیٹ

سمدھن سمدھن چٹائی بچھادوں بیٹھو ہمارے پاس
لڈّو چاہیے تو کندوئی تمھارا یار

پلواؤ پلواؤ مارا بھائی تم نے چائی کیوں نہ پلائی

کاکی کی بزرگی اور برسوں پرانی روایت کو نبھاتے دیکھ کر دولہے والوں کے خاندان کی عورتوں کے دبے جذبات کو بھی زبان مل گئی اور پھر سرے عام بیہودہ گالیوں اور چٹخارے دار گیتوں کا ایسا دور چلا کہ جنھیں سن کر ہم تمام لڑکیاں اس طرح لوٹ پوٹ ہوگئیں کہ پوری شادی کے دوران ہم ایک دوسرے کو کاکی کے گیت گا کر ہی چھیڑتیں رہیں جس کا اندازہ ہماری حرکتوں اور کاکی کی تالیوں سے دور بیٹھے ہم پر نظر جمائے میرے والد کو ہوگیا۔

”آخراب زمانہ اور کا اور ہوگیا ہے۔ بچے اعلیٰ تعلیم یافتہ، مہذب اور نئے زمانے کی سوچ رکھنے والے ہیں۔ ان تمام حرکتوں کا اُن پر کیا اثر پڑے گا۔ کاکی اس عمر میں تمھیں شرم نہیں آئی اس طرح کی حرکتیں کرتے“۔ ابّا دھیمے لہجے میں پہلی مرتبہ کاکی کو اپنی غلطی سے واقف کروارہے تھے۔

’کاکی بھی خاموشی سے ساری باتیں سنتی رہی اور پھر یکایک بولیٹ ٹرین کے موافق اپنے کمرے میں گئی اور اسی رفتار سے اپنا تھیلا ہاتھ میں لیے گالیاں دیتی ہوئی سڑک پر یہ جا وہ جا۔ زمانے نے کئی پلٹے کھائے، بچے جوان اور جوان بوڑھے ہو گئے۔ دادا حضور دنیائے فانی سے رخصت ہو گئے لیکن کاکی کی روٹھ کر مائکے چلے جانے کی عادت بدستور جاری رہی۔‘

کاکی بھی خاموشی سے ساری باتیں سنتی رہی اور پھر یکایک بولیٹ ٹرین کے موافق اپنے کمرے میں گئی اور اسی رفتار سے اپنا تھیلا ہاتھ میں لیے گالیاں دیتی ہوئی سڑک پر یہ جا وہ جا۔ زمانے نے کئی پلٹے کھائے، بچے جوان اور جوان بوڑھے ہوگئے۔ دادا حضور دنیائے فانی سے رخصت ہوگئے لیکن کاکی کی روٹھ کر مائکے چلے جانے کی عادت بدستور جاری رہی۔

پھر ایک نیا سلسلہ شروع ہوگیا۔ کاکی تبھی گھر میں قدم رکھتیں جب اُن کے بیٹے ہاتھ جوڑتے اور بہوئیں مگر مچھ کے آنسوں بہا کر اُن سے منتیں کرتیں۔ آخر اسی کے ذریعے تو وہ اپنی دیگر بزرگ سہیلیوں کے درمیان اپنے وقار اور اہمیت کو ثابت کرتی تھیں۔

کاکی کی زندگی بڑی دلچسپ تھی۔ آٹھ بیٹے جو بہ خوشی الگ الگ رہتے تھے کاکی کا بڑا احترام کرتے حالانکہ یہ اور بات ہے کہ کاکی کی حرکتوں کے سبب ساری بہوئیں دادا حضور کی جگہ کاکی کے دنیا سے کوچ کر جانے کی دعائیں کیا کرتی تھیں لیکن خدا کی مرضی کے آگے کس کا زور چلا ہے۔ دادا میاں کی موت نے تو کاکی کو جیسے پر لگا دیے۔

کاکی جب جہاں دل لگ جاتا یا یوں کہیے جہاں نمک مرچ لگانے کا موقع مل جاتا وہاں کچھ دن ٹک جاتیں۔ بیشتر وہ ہمارے ساتھ ہی رہتیں تھیں کیونکہ ابّا گھر کے بڑے تھے لہٰذا کاکی سب سے پہلے اُن کی ذمہ داری تھی۔ ساتھ ہی کاکی کے سب سے لاڈلے اور ہمارے سب سے چھوٹے چچا جن کو برباد کرنے میں کاکی کا اہم رول رہا ہے وہ بھی ہمارے ساتھ ہی رہتے تھے۔ دراصل چچا نے بالکل کاکی کا مزاج پایا تھا۔ ادھر کی ٹوپی اُدھر

کرتے آخر کو برباد ہو گئے۔ کاکی کی ساری چالاکی چچا کی چاپلوسی کے سامنے دھری رہ گئی۔ پہلے روپے پھر گہنے اور آخر کار جب گھر نیلام ہونے کی نوبت آ گئی تو کاکی نے اپنے لاڈلے بیٹے کی حرکتوں سے پردہ اُٹھایا۔ آخر سب بھائی الگ ہو گئے۔ چچا کو سدھارنے کی ذمہ داری ابّا نے لے لی جسے کاکی نے کبھی کامیاب نہیں ہونے دیا۔

کاکی پورے زمانے کی خبر رکھتی تھیں۔ شام ہوتے ہی عورتوں کا ہجوم چوک میں جمع ہو جاتا اور پورے دن ہونے والے واقعات بیان کیے جاتے۔ کس کے گھر میں کیا تکلیف ہے، کس کی بہو کیسی ہے، کون کہاں گیا تھا کہاں سے آیا، حتیٰ کہ لڑکے لڑکیوں کے درمیان ہونے والے اشاروں اور کون کس کے عشق میں مبتلا ہے اس کی خبر بھی کاکی کے پاس ہوتی تھی۔ اسی لیے ہم نے کاکی کو ''گوگل'' کا نام دے دیا تھا جہاں ہر خبر سرچ کرنے پر مل جاتی ہے۔ اگر کبھی کسی بات کا غلطی سے علم نہیں ہوتا تو شام تک کاکی اپنے خبریوں کو پتہ لگانے کا ذمہ سونپ دیتیں۔ کوئی بات جسے سب سے چھپایا جا رہا ہو وہ کاکی کے کانوں تک آ جائے تو صبح ہونے سے قبل ہی کاکی پورے محلّے میں اُس کا اعلان کر دیتیں۔

ایک مرتبہ کی بات ہے جب کاکی کی اسی حرکت پر پاس میں رہنے والی رحمت آپا نے کاکی پر گالیوں کی بوچھار کر دی۔ آخر کاکی نے کام ہی ایسا کیا تھا۔ دراصل کاکی نے اُن کی پوتی کے گھر سے بھاگ جانے کے راز کو اُس کے سسرال والوں کے سامنے مزید نمک مرچ لگا کر اُجاگر کر دیا، جس سے کافی مشکلوں کے بعد طے کیا گیا رشتہ ٹوٹ گیا۔ لہٰذا گھر میں جیسے طوفان آ گیا اور آتا بھی کیوں نہ۔ ہمارے دادا حضور کی نہ صرف اپنے سماج میں بڑی عزت تھی بلکہ آج تک کسی بھی شخص نے اُن سے اونچی آواز میں بات تک نہیں کی تھی۔ ہر ایک کے غم میں شریک ہونا اور ہر شخص کے مشکل حالات میں اُس کا ساتھ دینا دادا حضور اپنا فرض سمجھتے تھے۔ دادا حضور کی وفات کے بعد اُن کی بنائی عزت و وقار کا جنازہ کاکی نے کئی بار دھوم دھام سے نکالا۔

لیکن یہ پہلا موقع تھا جب کاکی کی وجہ سے کوئی اس طرح گھر میں آ کر گالیاں دے رہا تھا۔ ابّا کا غصہ اس مرتبہ ساتویں آسمان پر تھا پر بیچارے ابّا کو کاکی کے سپوٹرس کا اندازہ نہیں تھا۔ کاکی کے ایک راگ نے اُن کی تمام ٹیم کو چند منٹوں میں جمع کر دیا۔

''ارے میرا دھنی (شوہر) کیا مرا ان لوگوں کو میرا گھر میں رہنا بھی گوارا نہیں ہے۔ اللہ نے اُن کی جگہ مجھے کیوں نہ اُٹھا لیا۔ دو روٹی کے ٹکڑے دے کر جیسے مجھ پر احسان کر دیا۔ یا اللہ کہاں جاؤں''۔

کاکی کا تماشا پوری رات چلتا رہا۔ ہمیشہ کی مانند کاکی نہ صرف اپنے اوپر لگائے الزام کو بڑی صفائی سے نکار گئیں بلکہ رو رو کر ایسا ماحول بنانے میں بھی کامیاب ہو گئیں جس میں ابّا سب کی نظروں میں گناہ گار اور ماں پر ظلم کرنے والے نالائق بیٹے قرار دیے گئے۔ یہی نہیں کاکی نے اتنی صفائی سے جھوٹی قسمیں کھائیں کہ بیچاری رحمت آپا بھی کشمکش میں پڑ گئی اور آخر کار کاکی سے اپنا پیچھا چھڑا کر بھاگ کھڑی ہوئی۔

کافی رات ہو چکی تھی۔ ہم سب بار بار کاکی کے کمرے میں جا کر دیکھتے کہ شاید کہیں وہ پھر مائکے روانہ ہونے کی تیاری نہ کر رہی ہوں۔ لیکن اُس دن پہلی مرتبہ ایسا کچھ نہیں ہوا۔ اگلے دن صبح سویرے ہی کاکی گھر سے باہر چلی گئیں اور جب واپس لوٹیں تو پورے باورچی خانہ کے سامان کے ساتھ۔ اپنا کھانا الگ بنانے کے کاکی کے اس فیصلے پر محلّے کے ساتھ ساتھ گھر کے تمام افراد بھی حیرت زدہ رہ گئے۔ کاکی کو سمجھانے کی تمام کوششیں کی گئیں لیکن ہمیشہ کی طرح ناکامی ہی ہاتھ لگی۔

'کافی رات ہو چکی تھی۔ ہم سب بار بار کاکی کے کمرے میں جا کر دیکھتے کہ شاید کہیں وہ پھر مائکے روانہ ہونے کی تیاری نہ کر رہی ہوں۔ لیکن اُس دن پہلی مرتبہ ایسا کچھ نہیں ہوا۔ اگلے دن صبح سویرے ہی کاکی گھر سے باہر چلی گئیں اور جب واپس لوٹیں تو پورے باورچی خانہ کے سامان کے ساتھ۔ اپنا کھانا الگ بنانے کے کاکی کے اس فیصلے پر محلّے کے ساتھ ساتھ گھر کے تمام افراد بھی حیرت زدہ رہ گئے۔ کاکی کو سمجھانے کی تمام کوششیں کی گئیں لیکن ہمیشہ کی طرح ناکامی ہی ہاتھ لگی۔'

کاکی کے اس فیصلے پر جہاں سب دکھی تھے وہیں ہمارے چھوٹے چچا بڑے ہی خوش تھے۔ دراصل ہماری چچی نیند کی جتنی پکّی تھیں باورچی خانہ میں اُس سے کہیں زیادہ کچی۔ دن کا کھانا شام تک اور شام کا کھانا آدھی رات کو تیار ہو کر سامنے آتا۔ چچی کی خوبصورتی نے چچا کو کبھی اس بات

کی اجازت نہیں دی کہ وہ اپنی بیگم کو میک اپ سے پہلے کھانا تیار کرنے کی ہدایت دیں۔ آخر جب کاکی نے باورچی خانہ علیحدہ کیا تو چچا کو مزا آگیا۔ وقت پر ماں کے ہاتھ کا کھانا مل جائے آدمی کو اور کیا چاہیے۔ رفتہ رفتہ یہ ہونے لگا کہ جس کو بھی گھر میں جو کھانا ہوتا تھا کاکی سے فرمائش کرتا۔ کاکی کچھ دن تو محبت سے بنا کر سب کو کھلاتی رہیں پھر آخر جب بوڑھی ہڈیاں جواب دے گئیں تو سارے برتن اُٹھا کر سڑک پر پھینک دیے اور زور زور سے بچوں کی طرح رونے لگیں۔ کاکی کی منشا کو سمجھتے ہوئے امی نے پھر ہاتھ جوڑے اور سڑک پر بکھرے سارے برتن چچی نے بڑی بے شرمی سے اُٹھا کر اپنے باورچی خانہ میں سجا دیے۔

کاکی کی ان تمام حرکتوں کے باوجود بھی گھر کی رونق انھیں سے تھی۔ ایسی کہانیاں سناتیں جس میں سچ کم اور بے شمار جھوٹ شامل ہوتا۔ گھر کی بہوؤں کی باتیں ادھر سے اُدھر کرنے میں کاکی کو بڑا لطف آتا اور جب اُن کی باتوں سے جھگڑے ہوتے تو آگے آکر سب کو گالیاں دیتیں۔ ضرورت کے وقت سب کے ساتھ کھڑی رہتیں حالانکہ کرائے سے ملنے والی رقم صرف چھوٹے چچا کو نکما بنانے پر ہی خرچ کرتیں۔

میں کاکی کے بالکل قریب نہیں تھی اور نہ ہی اُن کی عادت اور حرکتیں مجھے پسند تھیں۔ کاکی کو بھی مجھ سے کوئی خاص محبت نہیں تھی۔ لیکن ایک دفعہ کی بات ہے جب چکن پوکس کے سبب میرا پورا جسم اور چہرہ اتنا خوفناک ہو گیا کہ اپنی شکل دیکھ کر میں خود رو پڑی۔ ساتھ ہی گھر کے تمام لوگ مجھ سے دور رہنے لگے اُس وقت کاکی نے نہ صرف میرا خیال رکھا بلکہ زندگی میں پہلی دفعہ پورے مہینے بھر میرے پاس ٹک کر رہیں۔

آخر کار وہ دن بھی آگیا جب کاکی اور گھر کے تمام افراد کی تمنا پوری ہوئی۔ کاکی کو حجِ مقدس کی ادائیگی کا شرف حاصل ہوا۔ کاکی کی خوشی تو واضح تھی ہی لیکن گھر کے تمام افراد کاکی کے حج پر جانے کے ساتھ ساتھ کچھ دنوں کے لیے حاصل ہونے والے سکون کے متعلق سوچ کر زیادہ خوش تھے۔ اس عظیم موقع پر کاکی نے کوئی رشتہ دار، پڑوسی، سہیلی حتیٰ کہ دور شہروں میں رہنے والے برسوں قبل کھو چکے نام بھر کے پہچان والوں کو بھی نہیں چھوڑا اور ہر ایک سے مل مل کر اپنے گناہ کی معافی مانگی اور دعاؤں کی گزارش کی۔

کاکی کی رخصتی کے وقت سب کے چہروں پر خوشی کے ساتھ ساتھ آنکھوں میں آنسو بھی تھے۔ کاکی اپنے بڑے سے کنبے کے ہر فرد کا ماتھا چومتے ہوئے زار و قطار روتی ہوئی ہزاروں دعائیں دے رہی تھیں۔ کاکی کے آنسوؤں نے جیسے گھر کے تمام لوگوں کے دلوں کو موم کر دیا۔ گھر کی ساری بہوئیں کاکی کے ارد گرد جی حضوری کرتی ایسی نظر آرہی تھیں جیسے پیچھے سے کاکی کے متعلق کہی گئی تمام باتوں سے شرمندہ ہوں۔ کاکی کو الوداع کہہ کر سب گھر کی طرف لوٹ آئے۔ کاکی کی غیر موجودگی نے جیسے گھر کی ساری رونق ہی چھین لی۔

وہ کہتے ہیں نہ کہ پیڑ اگر پھل نہیں دیتا تو کیا کم سے کم چھاؤں تو دیتا ہے۔

❑❑❑

Dr. Shahnaz Yusuf
528/33,Chipa Colony
O.T.C Scheme, Malla Talai
Udaipur-313001 (Rajasthan)

صاحبہ فردوس

کم ظرف

وہ بڑا ہی بے بس و مجبور ہو کر چچا جان کے گھر آیا تھا۔ اُس کے والد باقر حُسین صاحب کو دِل کا دورہ پڑا تھا جنھیں فوری طور پر اسپتال میں داخل کروا کر وہ ان کے پاس آیا ڈاکٹر نے جلد از جلد آپریشن کرنے پر اصرار کیا مگر اُس کے پاس آپریشن کے اخراجات اور دواؤں کے لیے پیسے نہیں تھے۔

اسی لیے وہ بہت لاچار ہو کر اپنے چچا کے آگے ہاتھ پھیلانے آیا تھا۔ صفدر حُسین کا نام شہر کی جانی مانی ہستیوں میں شامل تھا۔ اُن کا لیدر کا بزنس کافی اچھا چل رہا تھا جس کے باعث اُن کے حالات اپنے بڑے بھائی کے حالات سے زیادہ بہتر تھے۔ بلکہ صرف بہتر کیا شہر میں اُن کی اچھی خاصی ساکھ بنی ہوئی تھی مگر وہ جتنے ظاہری طور پر امیر تھے باطنی طور پر اُس سے کہیں زیادہ غریب تھے دولت کی اتنی افراط ہونے کے باوجود آج تک وہ کبھی اپنے سفید پوش بھائی کے کام نہ آسکے تھے۔

باقر صاحب اور ذکیہ بیگم کو اللہ نے ایک ہی اولاد نرینہ سے نوازا خود وہ ایک سرکاری ملازم تھے اُن کے پاس جو کچھ بھی تھا وہ حق حلال کی کمائی کا تھا اگر وہ چاہتے تو رشوت لے کر اپنے ضمیر کو ٹھوکر مارتے اور عیش کی زندگی بسر کرتے اور ضرورت پڑنے پر اُنھیں کبھی کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلانا پڑتا مگر باقر صاحب نے سچائی کا راستہ چنا اور اپنی بیوی اور بچے کو ہمیشہ حلال کا لقمہ کھلایا اُنھوں نے حمزہ کو ہمیشہ یہی سکھایا تھا کہ زندگی میں کتنی بھی مشکلات آئے محنت کرنے سے نہ گھبرانا۔ حمزہ تو بچپن سے ہی ماں باپ کا فرمانبردار بیٹا تھا اس لیے اُن کی یہ بات ذہن نشین کر لی۔

جس طرح سے باقر حُسین صاحب کی ایک اولاد تھی ویسے ہی صفدر حُسین کی بھی ایک ہی بیٹی تھی زرمین جو بڑی منتوں اور مرادوں کے بعد اُن کے گھر پیدا ہوئی تھی۔ زرمین کے بعد سکینہ بیگم کی کوئی اولاد نہیں ہوئی اور وہ مزید اولاد پیدا بھی نہیں کرنا چاہتیں تھیں کیونکہ اُنھیں اپنی جسمانی ساخت اور وزن کی فکر تھی۔ زرمین دیکھنے میں جتنی خوبصورت تھی اُس کا اخلاق اُس سے کہیں زیادہ بُرا تھا دولت کی ریل پیل اور والدین کے لاڈ پیار نے اُسے کافی ضدی، خودسر اور بدتمیز بنا دیا تھا وہ اپنے اوپر اپنی دوستوں پر بے دریغ پیسہ خرچ کیا کرتی اُس سے کوئی حساب لینے والا بھی نہیں تھا۔

مغرور اس قدر تھی کہ اپنی ناک پر مکھی بھی نہیں بیٹھنے دیتی تھی اپنے تایا کی فیملی کو وہ حقارت کی نظروں سے دیکھا کرتی۔ ابھی بھی وہ تیار ہو کر یونیورسٹی کے لیے نکل ہی رہی تھی کہ ڈرائنگ روم میں پریشان حال بیٹھے حمزہ کو نفرت و حقارت بھری نظروں سے دیکھتی وہاں سے چلی گئی۔

حمزہ کو زرمین ایک آنکھ نہ بھاتی کیونکہ وہ جانتا تھا بظاہر جو بہت خوبصورت نظر آتی ہے اُس کے خوبصورت چہرے کے پیچھے کتنی نفرت اور سیاہی ہے...

حمزہ پچھلے ایک گھنٹے سے صفدر صاحب کا انتظار کر رہا تھا اب تو اُسے

ڈرائنگ روم میں رکھی ایک ایک چیز ازبر ہو چکی تھی کہ کہاں کیا موجود ہے۔
طویل انتظار کروانے کے بعد سوٹ بوٹ میں ملبوس صفدر صاحب ڈرائنگ روم میں تشریف لائے اُنھیں دیکھ کر حمزہ نے سلام کیا اور احتراماً اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا جبکہ دوسری طرف سے لٹھ مار انداز میں جواب دیا گیا اور ساتھ ہی بیٹھنے کا اشارہ کیا وہ بیٹھتے ہی بغیر کسی تمہید کے اپنا آنے کا مدعا بیان کرنے لگا...
''ابو کو دِل کا دورہ پڑا ہے وہ اس وقت اسپتال میں داخل ہیں''
اُس کی بات ابھی مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ صفدر صاحب لیے دیے انداز میں اظہارِ افسوس کرنے لگے جیسے کسی اجنبی کے بارے میں کہا ہو۔
''اوہ.... بہت دُکھ کی بات ہے''
اُن کے بیگانہ لہجے پر اُسے خود سے شرم آنے لگی کہ وہ یہاں آیا ہی کیوں مگر خود پر جبر کر کے اپنی بات کو جاری رکھا..
''وہ مجھے بابا کے آپریشن کے لیے کچھ رقم چاہیے جیسے ہی میرے پاس پیسے آجائیں گے میں آپ کو وہ ساری رقم لوٹا دوں گا۔''
حمزہ کی بات پر اُن کے لبوں پر استہزائیہ مسکراہٹ اُبھری تھی وہ اسے سرتاپا دیکھتے ہوئے بولے۔
''اچھا تم لوٹاؤ گے رقم!''
اُن کی بات پر حمزہ نے پر اُمید نظروں سے دیکھتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔
حمزہ کو اُن کا استہزائیہ لہجہ بہت بُرا لگا تھا بُرا تو اُسے یہاں بیٹھ کر اُن کے آگے ہاتھ پھیلانا بھی لگ رہا تھا مگر کیا کرتا اگر اُن سے مدد نہ لیتا تو کس کے پاس جاتا...
صفدر حسین نے اُس سے رقم پوچھی تو اُس نے بتادی مگر چھ لاکھ کا سُن کر ہی اُن کا منہ بن گیا اور نہایت ہی بے رخی سے گویا ہوئے۔
''فی الحال تو میرے پاس اتنی رقم نہیں ہے''
اُن کی سفاکی پر دِل میں مدد ملنے کی جو موہوم سی آس تھی ختم ہوگئی اُسے احساس ہوا کہ بے تحاشہ دولت خون سفید کر دیتی ہے۔۔
صفدر حسین نے اُسے چھ لاکھ کی رقم تو نہیں دی مگر ہاں ایک لاکھ کا چیک دے کر اپنی تنگ دستی کا ثبوت دیتے ہوئے اُس کی مجبوری کا مذاق بھی اُڑایا تھا..
حمزہ نے اُن کا دیا ہوا ایک لاکھ کا چیک وہی میز پر رکھ دیا اور بغیر کچھ کہے وہاں سے چلا گیا۔
اُس کے یوں اُٹھ کر جانے پر صفدر صاحب کو اپنی تذلیل محسوس ہوئی مگر وہ بس اُس کی پشت کو گھورتے رہ گئے۔
اُنھیں جیسے یقین تھا کہ وہ یہ رقم لینے ضرور آئے گا۔

☆☆☆

حمزہ اپنا مضمحل وجود لیے گھر جارہا تھا۔ اپنے تمام دوستوں سے اُس نے مدد مانگی تھی مگر کسی کے پاس اتنی رقم نہیں تھی کہ کوئی اُس کی مدد کرتا۔ تب ہی اُسے راستے میں باقر صاحب کے پرانے دوست مل گئے۔ اُنھوں نے حمزہ سے اُس کی پریشانی کا سبب پوچھا تو اُس نے اُنھیں تمام بات من وعن بیان کردی ۔جس پر وہ بھی تھوڑے سے پریشان ہوئے پھر اُنھوں نے اُسے اپنے گھر لے جاکر چھ لاکھ کا چیک دے دیا۔ کچھ دیر تک تو حمزہ کی سمجھ نہ آیا کہ یہ کیسے ہوگیا پھر اُسے یقین ہوا تو وہ فوراً اسپتال گیا اور وہ چیک جمع کروادیا۔

حمزہ اپنا مضمحل وجود لیے گھر جارہا تھا۔ اپنے تمام دوستوں سے اُس نے مدد مانگی تھی مگر کسی کے پاس اتنی رقم نہیں تھی کہ کوئی اُس کی مدد کرتا۔ تب ہی اُسے راستے میں باقر صاحب کے پرانے دوست مل گئے۔ اُنھوں نے حمزہ سے اُس کی پریشانی کا سبب پوچھا تو اُس نے اُنھیں تمام بات من وعن بیان کردی ۔جس پر وہ بھی تھوڑے سے پریشان ہوئے پھر اُنھوں نے اُسے اپنے گھر لے جا کر چھ لاکھ کا چیک دے دیا۔ کچھ دیر تک تو حمزہ کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کیسے ہوگیا پھر اُسے یقین ہوا تو وہ فوراً اسپتال گیا اور وہ چیک جمع کروادیا۔
جس سے باقر صاحب کا آپریشن بہ خیر و عافیت ہوگیا تھا۔
باقر صاحب صحت یاب ہو کر گھر آگئے تھے اُنھیں صحیح سلامت دیکھ کر وہ اپنے رب کا مشکور تھا جس نے غیبی طور پر اُس کی مدد کی تھی۔ باقر صاحب کو گھر آئے ایک مہینے سے زائد دن ہو چکے تھے مگر نہ صفدر صاحب اپنے بڑے بھائی کی عیادت کے لیے آئے تھے نہ ان کی بیوی بیٹی میں سے کوئی آیا تھا۔

حمزہ نے انجینئرنگ کی ڈگری لے رکھی تھی۔ اُسے کافی جدوجہد کرنے کے بعد ایک اچھے فرم میں جاب مل گئی تھی۔ جس کے باعث گھر کے حالات کچھ بہتر ہوئے تھے۔ حمزہ نے جو قرض باقر صاحب کے دوست سے لیا تھا وہ بھی لوٹا دیا تھا۔

ذکیہ بیگم ایک سلیقہ مند خاتون تھیں وہ باقر صاحب کی مختصر سی تنخواہ میں گھر چلایا کرتیں تھیں۔ اُن سب کے خرچے بھی زیادہ نہیں تھے اس لیے اب حمزہ کی تنخواہ بینک میں جمع ہوتی جاتی تھی۔ کچھ ہی سالوں کی جدوجہد کے بعد اُن کے حالات بدل گئے تھے۔ حمزہ نے محلے کا گھر بیچ کر ایک پوش ایریا میں لون لے کر گھر خرید لیا تھا۔ اب اُن کا گھر تمام آسائشوں سے پُر تھا جو ایک اچھی زندگی گزارنے کے لیے انسان کو چاہیے۔

ان گزرے ہوئے سالوں میں اُس نے کبھی پلٹ کر چچا جان کے گھر کی طرف نہیں دیکھا تھا جہاں دولت سے اُن کے دل سیاہ ہو چکے تھے۔ جہاں سگے خون سفید ہو چکے تھے۔

خدا اپنے بندوں کو رسوا نہیں کرنا چاہتا مگر جب بندہ خود کو زمین کا خدا سمجھ بیٹھتا ہے۔ اپنے آگے کسی کو نہیں گردانتا ہے اُس کی مقرر کردہ حدود کو توڑتا ہے تو پھر اللہ بھی اُسے رسوا کرتا ہے۔

ان ہی دنوں اُسے خبر ملی تھی کہ چچا جان کے گھر ریڈ پڑی ہے اور وہ بُری طرح کنگال ہو چکے ہیں۔ وقت نے ایسی کروٹ لی تھی کہ وہ جو زمین پر بڑے اکڑ کر گردن تان کر چلا کرتے تھے اب اُن کے سر شرمندگی سے جھک گئے تھے۔

رب کی زمین پر تکبر کرتے وقت ہم بھول جاتے ہیں کہ انسان وقت کے ہاتھوں کا کھلونا ہے وقت انسان کو توڑ پھوڑ کر ایسے زخم لگاتا ہے جنھیں اُسے خاموشی سے سہنا پڑتا ہے اور صفدر صاحب کے ساتھ وقت نے ایسا ہی کھیل کھیلا تھا کہ اُن کے سر اُٹھانے کی جگہ نہیں بچی تھی۔

باقر صاحب کو جب اپنے چھوٹے بھائی کے دکھ کا پتہ چلا تو اُنھیں بہت افسوس ہوا۔

اتنا سب کچھ کھو دینے کے بعد بہت گہرا صدمہ پہنچا تھا جس کے باعث اُنھیں ہارٹ اٹیک آیا تھا۔

اپنے بھائی کی بیماری کی خبر سن کر باقر صاحب بے قرار ہو گئے تب ہی وہ فوراً دوڑتے ہوئے ہاسپٹل آئے تھے۔ اُن کے ساتھ ذکیہ بیگم اور حمزہ بھی تھا۔ حمزہ تو پہلے ہی اپنے ابو کے اسپتال جانے کے خلاف تھا مگر جب ذکیہ بیگم نے اُسے رسانیت سے سمجھایا تو وہ خاموش ہو کر اُن کی عیادت کرنے چلا آیا۔

زمین پر اکڑ کر چلنے والے چچا جان اس وقت بہت ہی کمزور مضمحل وجود لیے بیڈ پر پڑے تھے۔ اُن سے کچھ فاصلے پر مغرور سی چچی اور روتی ہوئی زرمین بیٹھی تھی۔

صفدر صاحب، باقر صاحب کو دیکھ کر دکھ سے مسکرائے پھر بمشکل اپنی جگہ سے اُٹھ کر بیٹھ گئے اور اپنے بھائی سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگنے لگے۔ باقر صاحب تو صدا کے رحم دل تھے اپنے بھائی کے جڑے ہوئے ہاتھوں کو دیکھ کر اُنھوں نے اُنھیں گلے لگا لیا۔ پھر اپنے چھوٹے بھائی کی خواہش سُن کر وہ حیران رہ گئے۔

صفدر حُسین کو یقین ہو چکا تھا کہ اب وہ کبھی ٹھیک نہیں ہو پائیں گے تب ہی وہ اپنی بیٹی کو اپنی آنکھوں کے سامنے کسی محفوظ ہاتھوں میں سونپنا چاہتے تھے۔ اُنھوں نے اپنی آخری خواہش اپنے بھائی کو بتا دی جس پر وہ کچھ پل کے لیے سرگرداں سے ہو کر رہ گئے۔

حمزہ بھی وہی کھڑا تھا چچا جان کی بات سُن کر وہ اپنی جگہ پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ وہ کیسے اپنے مفاد کے لیے اپنی بگڑی ہوئی بدتمیز بیٹی کو اُس کی پرسکون زندگی برباد کرنے کے لیے شامل کرنا چاہتے ہیں۔

اُس نے نفرت سے سر جھکائے آنسو بہاتی ہوئی زرمین کو اور چچا جان کو دیکھا اور وہاں سے نکل گیا۔ اُس کی اس حرکت پر باقر صاحب شرمندہ ہو کر رہ گئے پھر اپنے بھائی سے معذرت کرتے ہوئے اُس کے پیچھے گئے اُسے سمجھاتے ہوئے بولے۔

''جانتا ہوں صفدر کی بات تمھیں پسند نہیں آئی ہے۔ تم کبھی بھی زرمین کو اپنی زندگی کا حصہ نہیں بنانا چاہو گے مگر بیٹا کیا ہم بھی اُن کی طرح بن جائیں اُن کی طرح رویہ اختیار کر لے جنھوں نے وقت پڑنے پر ہمارا ساتھ نہیں دیا تھا یاد رکھو وہ لوگ بہت کم ظرف ہوتے ہیں جو مصیبت کے وقت اپنوں کا ساتھ نہیں دیتے۔ اور صفدر بہت کم ظرف تھا جس نے تمھاری مدد نہیں کی مگر یہ بھی تو دیکھو کہ وہ اُس وقت تمھاری مدد کرتا تو تم آج اس مقام پر نہیں ہوتے تم میں اور صفدر میں بہت فرق ہے۔ تم زرمین کے لیے اپنے دل میں گنجائش پیدا کرو محبت نکاح کے بعد ہو جائے گی''

اُن کے اتنا سمجھانے پر بھی حمزہ انکار کرتے ہوئے بولا۔

''میں زرمین کی تمام بدتمیزیوں کو فراموش بھی کر دوں تو مجھ میں اتنا ظرف نہیں ہے کہ میں چچا جان کو معاف کر سکوں سوری ابو میں یہ نہیں کر سکتا''۔ اُس کی بات پر باقر صاحب اُسے مزید سمجھاتے ہوئے بولے۔

''مانتا ہوں تم اپنے دل سے وہ بات نہیں نکال سکتے ہو مگر اپنا دل کدورت سے پاک تو کر سکتے ہو نا جو بالکل ہمارے اختیار میں ہے۔ منفی

سوچ انسان کو بھی منفی بنا دیتی ہے مگر ہم مثبت ہو کر سامنے والے کے بارے میں سوچیں تو دنیا خود بخود ہمارے لیے اچھی ہو جاتی ہے۔ اس لیے تم اپنے دل میں موجود نفرت کو مٹا کر اُسے معاف کر دو اور زرمین کو قبول کر لو۔ دیکھنا وہ تمھارے لیے بہترین ساتھی ثابت ہوگی۔

اُن کی بات پر حمزہ اپنے والد کو دیکھتا رہ گیا جو کتنے عظیم تھے جو اس قدر سچائی، خلوص اور محبت سے بنے تھے جو بے غرض دوسروں کے کام آتے تھے اور سچی محبت کرتے تھے۔ جو دوسروں کی بڑی سے بڑی غلطیوں کو بھی معاف کرنے کا خود میں ظرف رکھتے تھے۔ وہ اپنے باپ کی سچائی اور خلوص کو بے مول نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے اُس نے زرمین کے لیے حامی بھر لی تھی۔

آناً فاناً نکاح ہوا تھا زرمین اُن کے گھر رخصت ہو کر آ گئی تھی وہ آج اُس شخص کے نام کی سیج سجائے بیٹھی تھی جس کے چہرے کو دیکھنا تک اُسے گوارہ نہیں تھا۔

وہ قسمت کے اس کھیل پر ششدر سی ہو کر رہ گئی تھی۔ جب اُس کے سامنے صفدر صاحب نے اُس کا پرپوزل دیا تھا تو اُسے یقین تھا کہ حمزہ انکار کر دے گا مگر خلاف توقع اُس کا مان جانا اُسے حیران کر گیا تھا۔

وہ اپنے تایا جان کی محبت و خلوص کی مرید ہو چکی تھی۔ مگر حمزہ کے مان جانے کے پیچھے اُسے کوئی انتقامی اقدام لگا تھا تب ہی تو وہ اس قدر گھبرائی ہوئی تھی۔

آہستہ سے دروازہ کھول کر حمزہ اندر آیا تو وہ اپنی جگہ سمٹ کر بیٹھ گئی۔ دل کی دھڑکنیں تیزی سے دھڑکنے لگی تھیں دل میں خدشات اور وسوسوں نے الگ جگہ بنا رکھی تھی۔

وہ سر جھکائے شرمندہ سی بیٹھی تھی تبھی وہ بیڈ پر بیٹھ گیا اور اُس کا نازک سا ہاتھ پکڑ کر دوسرے نمبر کی اُنگلی میں گولڈ کی رنگ پہنا دی۔

اُس کی اس حرکت پر زرمین متحیر سی رہ گئی اُس نے اپنا جھکا ہوا سر اُٹھا کر اُسے دیکھا جو اُسے ہی محبت سے دیکھ رہا تھا زرمین کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیوں اُس کے ساتھ ایسا کر رہا ہے۔ حالانکہ وہ تو اُس کے بہت بُرے سلوک کی حق دار تھی۔ وہ اس وقت اُس سے جتنی بدتمیزی کرتا اُسے جتنا سناتا وہ سر جھکائے سن لیتی۔

حمزہ جانتا تھا وہ کیوں اُسے ایسے حیران ہو کر دیکھ رہی ہے تبھی وہ کھنکارتے ہوئے بولا۔

''جانتا ہوں آپ کو میرے رویے نے حیران کر دیا۔ یقیناً آپ مجھ سے یہ توقع کر رہی تھیں کہ میں آپ سے بدلا لوں گا آپ کی بے عزتی کروں گا۔''

اُس کی بات پر وہ اثبات میں سر ہلا گئی تب ہی وہ دھیمے سے مسکراتے ہوئے بولا۔

''جب میں آپ کے گھر سے بے عزت ہو کر آیا تھا اُس وقت آپ سے اور چچا جان سے شدید نفرت محسوس ہو رہی تھی اور میں نے سوچ بھی لیا تھا کہ اپنی بے عزتی کا بدلا چچا جان کو نیچا دکھا کر لوں گا اور اللہ نے مجھے وہ موقع بھی فراہم کیا تھا مگر میری پرورش اس نہج پر نہیں ہوئی ہے کہ میں کسی سے بدلا لوں۔

یہ میرے والدین کی اچھی تربیت کا ہی نتیجہ ہے کہ میں آج ایک اچھا انسان بن سکا ہوں۔ مجھے فخر ہے اپنے والدین پر وہ جو صرف محبت کرنا جانتے ہیں اور غلطی کرنے والوں کو سزا دینے کے بجائے انھیں معاف کر کے آگے بڑھنا جانتے ہیں۔

آپ بے فکر رہیں میں نے آپ کو پورے دل سے قبول کیا ہے۔ میں آپ سے کوئی بدلا نہیں لوں گا۔ اُن سب کی اعلیٰ ظرفی دیکھ کر اپنی آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو صاف کرتے ہوئے وہ یہ سوچنے لگی کہ اُن جیسے کچھ لوگ دولت کے نشے میں اتنے ڈوب جاتے ہیں کہ وہ جان ہی نہیں پاتے کہ طاقت کے نشے میں چور وہ کتنے لوگوں کو اپنے قدموں کے نیچے کچل کر آگے بڑھ رہے ہیں۔ مگر جب اُن ہی لوگوں کے قدموں تلے سے زمین کھینچ لی جاتی ہے تو دنیا کا نیا روپ اُن کے سامنے آتا ہے۔

''ایم سوری مجھے معاف کر دیں میں نے اور پاپا نے تایا جان، تائی جان اور آپ کا بہت دل دکھایا ہے''

اُس کے جڑے ہوئے ہاتھ دیکھ کر حمزہ مسکراتے ہوئے اُس کے تھوڑے قریب آیا اور اُس کے ہاتھ الگ کرتے ہوئے بولا۔

''بس بہت ہو گیا۔ معافی کی کوئی ضرورت نہیں''۔

اُس کی اس بات پر وہ شرما سی گئی اُس کے سُرخ چہرے پر حیا کے رنگ دیکھ کر وہ بھی مسکرا پڑا حمزہ جانتا تھا کہ اب وہ نک چڑی زرمین نہیں رہی بلکہ سمجھدار سی مسز حمزہ بن گئی ہے۔

□□□

Saheba Firdous

D/o. Mohammad Ismail

Village:Anjangaon Surji

Dist: Amravati-444705 (M.S)

ڈاکٹر مشتاق احمد

عورت

خوابِ واحد کی تعبیر ہے تو
حدیثِ آدمؑ کی تفسیر ہے تو
تو مریمؑ و آمنہؓ اور خدیجہؓ ہے
یہ تیرا مقدر کہ تو بنتِ حوّاؑ ہے
سیتا ، پاروتی اور اہلّیا تو ہے
میتری، گارگی اور رادھا تو ہے
بے جسم روح کی جان ہے تو
اداس چہروں کی مسکان ہے تو
تیری عظمت پہ رشک کرتا ہے افق
تیرے قدموں میں ہے جنّت، ماں ہے تو
تیری دعاؤں سے صحرا میں چشمہ پھوٹا
سیراب ہوئی دنیا اور ہر اک طلسم ٹوٹا
تیرے دم سے دور ہوئی خانۂ ابراہیمؑ کی ویرانی
تیرے دم سے پُر بہار ہوئی محبوبِ خدا کی زندگانی
تو نے دنیا کو اخوت کی ابدی نشانی دی ہے
فرہاد و مجنوں اور رانجھا کی کہانی دی ہے

تو رضیہ، میرا اور جھانسی کی رانی ہے
تیرا روپ انیک، تو کبھی شعلہ کبھی پانی ہے
تو باپ کے دلوں کی دھڑکن ہے
تیرے وجود سے آباد گھر آنگن ہے
اپنے بھائی کی آنکھوں کا نور ہے تو
اپنے شوہر کی ازلی وجہِ مخمور ہے تو
قصۂ مختصر سن لے، تو میری زباں سے
الفاظ قاصر ہیں اب، لاؤں کہاں سے
تو محض حیاتیاتی افزائش نہیں ہے
تو رونقِ بزم کی نمائش نہیں ہے
تو وجہِ گردشِ افلاک ہے
تو سراغِ زیستِ لولاک ہے
تو عورت ہے، عظمتِ کائنات ہے
عقدِ ثریا سے بلند تیری ذات ہے
خوابِ واحد کی تعبیر ہے تو
حدیثِ آدمؑ کی تفسیر ہے تو

Dr. Mushtaque Ahmad
Principal
C. M. College
Quilaghat, Rahamganj
Darbhanga-846004 (Bihar)

میمونہ علی چوگلے

سپنوں کا راج محل

میں مزدور!
بناتا ہوں گھر
جھیل کر موسم کی مار
ٹھٹھری سردیوں اور تپتی دوپہروں میں
ڈالی ہیں اَن گنت گھر پر چھتیں
سجائے ہیں ان کے آنگن!
اور—
سجائے ہیں میں نے بھی کچھ سپنے
پکّی ہو جھونپڑی اپنی
راج محل جیسی!!

ساری عمر پھونکا ہے چولہا بیوی نے
سڑک کے چوراہے پر
کھڑی رہی برسوں سے
ایک بالٹی پانی کے لیے میونسپلٹی کے نلکوں پر!

گھٹنوں چلے ہیں دھول بھری گلیوں میں
میرے ننھے منے بچے
اور
سوئے ہیں چیتھڑوں کے پالنے میں
یا کبھی سیمنٹ کی بوریوں پر کھلے آسمان کے نیچے!

پھر بھی
میں نے سجائے ہیں کچھ سپنے
ان کے ساتھ نہیں ہوگا اب
ایسا کچھ بھی—!!
مگر
پتہ ہی نہیں چلا کب بڑے ہو گئے بچے
پکڑا دیے میں نے انھیں بھی تسلے
اپنی آنکھوں میں
سپنوں کو زندہ رکھنے کے لیے
نام لکھ دیا ان کا بھی
مزدوروں کی لسٹ میں!!

Maimuna Ali Chougle
304/B Panch Dhara
Panch Marg, Versova-400061
Mumbai- (M.S)

لذیذ پکوان

ہنی مسٹرڈ ڈپ

مسٹرڈ پیسٹ ایک کھانے کا چمچ

مایونیز دو کھانے کے چمچ، شہد ایک کھانے کا چمچ، نمک ایک چٹکی، کالی مرچ ایک چٹکی

1. ایک پیالے میں مسٹرڈ پیسٹ، مایونیز، شہد، نمک اور کالی مرچ ڈال کر مکس کر لیں۔
2. ہنی مسٹرڈ ڈپ تیار ہے۔

اسٹرابیری جیم

کٹی اسٹرابیری ایک کلو، چینی ایک کلو، لیموں کا رس ایک چوتھائی کپ

1. اسٹرابیریز کو دھو کر کاٹ لیں۔

2. اب انھیں ایک پلاسٹک کے پیالے میں چینی کے ساتھ ڈال کر رات بھر کے لیے فریج میں رکھ دیں۔
3. اگلی صبح اسے ایک پین میں پکائیں، یہاں تک کہ چینی حل ہو جائے۔
4. اب بیس منٹ مزید پکائیں کہ چینی جمنے لگے۔
5. چولہا بند کر دیں اور لیموں کا رس شامل کر کے اُبال کر خشک کی ہوئی بوتلوں میں بھر دیں۔

لوکی کا رائتہ

لوکی آدھا کپ (کدوکش کیا ہو)

دہی دو کپ، نمک چوتھائی چائے کا چمچ، کالا نمک چوتھائی چائے کا چمچ، رائی کا پاؤڈر آدھا چائے کا چمچ، زیرہ پاؤڈر آدھا چائے کا چمچ

1. کدوکش کی ہوئی لوکی کو دو کپ پانی میں ہلکی آنچ پر اُبالیں اور جب پانی خشک ہوجائے تو اسے آگ سے اُتار کر ٹھنڈا ہونے دیں۔

2. دہی کو پھینٹ لیں اور اس میں پکائی ہوئی لوکی اور تمام اجزاء شامل کردیں۔فریج میں ٹھنڈا کر کے پیش کریں۔

مربہ انناس

اجزا: انناس ایک کلوگرام، پھٹکری ایک چٹکی، چینی ڈیڑھ کلوگرام، زعفران 2 ماشہ، چونا ایک ٹیبل اسپون، روح کیوڑہ 2 ٹیبل اسپون (پان میں استعمال ہونے والا چونا لیں)

ترکیب: انناس زیادہ پکا ہوا نہ ہو اور نہ ہی کچا ہونا چاہیے۔ سب سے پہلے انناس کو اچھی طرح سے چھیل کر اس کے گول گول قتلے تراش لیے جائیں اور ان کو کانٹے سے اچھی طرح گود لیا جائے۔ اس کے بعد چونے کو پانی میں حل کر کے رکھ دیں۔ چونا نیچے بیٹھ جائے تو اوپر سے نہایت احتیاط کے ساتھ پانی کو نتھار لیا جائے اور اس پانی میں انناس کے ٹکڑے دس پندرہ منٹ تک بھگو کر چھوڑیں۔ پندرہ منٹ کے بعد ان ٹکڑوں کو پانی میں سے نکال لیا جائے۔ ایک دیگچی کو چولہے پر چڑھا دیں اور جب انناس کے ٹکڑے پک کر نرم پڑ جائیں تو نیچے اتار کر پانی نچوڑ دیں اور ٹکڑوں کو کسی چھلنی میں ڈال کر خشک کرلیں۔ اس کے بعد چاشنی تیار کر کے انناس کے ٹکڑے ڈال دیں اور پکنے دیں۔ جب چاشنی تین تار کی ہو جائے تو زعفران کو کیوڑہ میں پیس کر چاشنی میں ملا دیں اور پھر اتار لیں۔ جب ٹھنڈا ہوجائے تو مرتبان میں ڈال کر اس کا ڈھکنا اچھی طرح سے بند کردیں۔ نہایت ہی عمدہ اور لذت سے بھرپور مربہ ہے۔ صحت کے لیے بہت ہی مفید ترین ہے۔

ہوم میڈ چاٹ مصالحہ

اجزا: چھوٹی الائچی ایک سے دو عدد، لال مرچ پاؤڈر ایک چائے کا چمچ، کالا نمک آدھا چائے کا چمچ، نمک آدھا چائے کا چمچ، اجوائن آدھا چائے کا چمچ، لونگ تین سے چار عدد، دار چینی ایک عدد، کالی مرچ دس سے بارہ عدد (ثابت) زیرہ دو چائے کے چمچ (بھونا اور پسا)، دھنیا دو چائے کے چمچ (بھونا اور پسا)، ٹاٹری آدھا چائے کا چمچ

ترکیب: 1. ایک پیالے میں کالا نمک، لال مرچ پاؤڈر، نمک، اجوائن، لونگ، چھوٹی الائچی، دار چینی، کالی مرچ، دھنیا، زیرہ پاؤڈر اور ٹاٹری ڈال کر مکس کریں۔

2. پھر اسے بلینڈر میں ڈال کر بلینڈ کریں یہاں تک کہ تمام اجزاء اچھی طرح پس جائیں۔

3. چاٹ مصالحہ تیار ہے۔

(بحوالہ: www.khanapakana.com)

□□□

شکیل احمد

حالات کے اعتبار سے غذا اور خوراک

عمر، جنس اور پیشہ کے لحاظ سے خوراک اور غذا کی ضرورت مختلف ہوتی ہے۔ زندگی کے مختلف ادوار میں مختلف غذا اور مقدار کی خوراک درکار ہوتی ہے۔ ایک عمر کے دو آدمیوں میں بھی ان کے پیشہ اور کام کے لحاظ سے غذا میں اختلاف ہوتا ہے۔ عورتوں اور مردوں کی غذا اور خوراک میں بھی فرق ہے کیونکہ عورت کے جسم میں ہونے والی تبدیلیاں مرد سے بالکل مختلف ہوتی ہیں۔ ذیل میں مختلف حالات میں غذا کی ضرورت کا مختصر تذکرہ کیا جاتا ہے۔ انسان کی زندگی اور نشو ونما کی ابتدا چونکہ ماں کے پیٹ سے شروع ہوتی ہے اس لیے دورانِ حمل ماں کی غذاؤں کا اثر جنین کی نشو ونما پر پڑتا ہے۔ دوران رضاعت بھی ماں کی غذا کا اثر بچے کی زندگی، نشو ونما اور صحت پر پڑتا ہے اس لیے پہلے ماں کی غذا سے ہی ابتدا کی جاتی ہے۔

دورانِ حمل ماں کی غذا

بچہ کی نشو ونما اس کی پیدائش سے قبل ماں کے پیٹ میں شروع ہو جاتی ہے۔ اس وقت اس کی غذا خالص ماں کا خون ہے۔ مختلف اعضا کی تخلیق اور تعمیر کے لیے غذائیت کے سارے عناصر اس کو ماں کی غذا سے حاصل ہوتے ہیں۔ اس لیے دورانِ حمل ماں کی غذاؤں کا انتخاب ماں اور بچے دونوں کا لحاظ رکھ کر کرنا چاہیے۔ اس کے لیے ضروری نہیں کہ ماں بچے کے لیے الگ سے کوئی غذا استعمال کرے بلکہ قدرتی طور پر ماں کی غذا ہی بچے کے لیے بھی کام دیتی ہے۔ خوبی کی بات یہ ہے کہ ماں کی غذا میں بچے کے لیے نقصان دہ عناصر بھی قدرتی طور پر بچے کو نقصان نہیں پہنچاتے۔

دورانِ حمل ماں کا خون بچے کی ساخت میں بہت استعمال ہوتا ہے۔ اس لیے ایسی غذائیں جن سے خون زیادہ بنتا ہے، ماں کو استعمال کرنا چاہیے۔ یہ وہ غذائیں ہیں جن میں لوہا زیادہ پایا جاتا ہے۔ حاملہ عورت کو تقریباً 15 ملی گرام لوہا روزانہ غذا میں لینا چاہیے۔ اگر خون کی بہت کمی ہو تو کلیجی کا عرق یا الگ سے دواؤں کی شکل میں لوہا استعمال کرنا چاہیے۔ لوہے کی طرح کیلیم بھی ضروری ہے تاکہ بچے کی ہڈیوں کی ساخت ٹھیک ہو سکے۔ تقریباً 105 گرام کیلیم روزانہ ملنا چاہیے۔ اس کے لیے زیادہ کیلیم کی غذائیں استعمال کرنا چاہیے۔ مندرجہ ذیل خاکہ میں حمل سے قبل، دوران حمل اور دوران رضاعت عورت کی خوراک میں مختلف اجزا کی ضروری مقدار بتلائی گئی ہے اس سے دورانِ حمل اور دودھ پلانے کے دوران غذائیت کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

عمر سال۔ توانائی۔ پروٹین کیلیم۔ لوہا۔ وٹامن اے۔ تھایامن۔ ربوفلاون۔ اسکوربک ایسڈ، وٹامن بی

کلوکیلاری۔ گرام ملی گرام ملی گرام(I.U) (ملی گرام) (ملی گرام) (ملی گرام) (I.U)

قبل حمل 18 سے 35 2100 58-800-15-) 5000 0.5 1.3 79

دوران حمل دوسرا 2300- 78 20.1500- 6000- 1.0 1.6 100 400

تیسرا سہ ماہی

دوران رضاعت 3100 98-1300 ,26- 8000 1.2- 1.9 100 400

حاملہ عورت کی غذا سادی اور مولد خون ہونا چاہیے۔ خالص لحمی غذائیں ان کے لیے اچھی نہیں ہوتی ہیں۔ پھل اور سبزیاں ضرور استعمال

کرنا چاہیے۔ زیادہ مصالحہ دار اور ثقیل چیزوں سے پرہیز کرنا چاہیے۔ عام دنوں کے مقابلہ دورانِ حمل عورتوں کو پروٹین کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ تقریباً100 گرام پروٹین کا اوسط بہت اچھا ہے۔ اس کے لیے دودھ سب سے زیادہ مناسب ہے۔ حاملہ عورتوں کو2500 کلو کیلاری سے3000 کلو کیلاری توانائی روزانہ چاہیے۔ اسی حساب سے کاربوہائیڈریٹ اور چکنائی کا استعمال کرنا چاہیے۔ زیادہ چربی نقصان دہ ہے۔ انھیں شحمیات کا استعمال کرنا چاہیے۔ جن میں ضروری فیٹی ایسڈ موجود ہوں۔ ضروری ہے کہ دورانِ حمل ماں کو ضرورت کے مطابق مکمل غذا دی جائے خاص کر کیلسیم، وٹامن ڈی اور لوہا۔ کیلسیم کی گولی کھانے سے بہتر ہے کہ اس کو دودھ سے پورا کیا جائے تاکہ اسی کے ساتھ دوسرے ضروری اجزا بھی حاصل ہوسکیں۔ وٹامن ای حاملہ عورت کے لیے ضروری ہے۔ اس سے ماں اور جنین دونوں کی حفاظت ہوتی ہے اور بچے کی صحیح نشوونما ہوتی ہے، جس سے بچہ تندرست پیدا ہوتا ہے۔ یہ وٹامن کیروٹین اور ضروری فی ایسڈ کے استعمال ہونے میں مدد دیتا ہے۔ عام حالت میں دو ملی گرام وٹامن ای کافی ہے۔ لیکن حمل کے دوران پانچ ملی گرام روزانہ کی ضرورت ہے۔ اس لیے ان ایام میں وٹامن ای رکھنے والی غذاؤں کا استعمال کرنا چاہیے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ حاملہ عورتوں کو مناسب مقدار میں آیوڈین کی بھی ضرورت ہے، جو مناسب غذاؤں سے حاصل کی جاسکتی ہے۔

ماں کی اچھی اور مکمل غذا ہونے سے بچے ٹھیک اور تندرست پیدا ہوتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ حمل سے قبل بھی ماں کو اچھی اور مناسب غذا ملے تاکہ حمل شروع ہونے کے وقت اس کو تمام ضروری اجزا مل رہے ہوں۔ اگر حمل سے قبل اور حمل کے دوران ماں کو اچھی اور صحیح غذا دی جائے تو پیدائش کے وقت بچے سالم اور صحت مند ہوں گے۔ قبل حمل اور دورانِ حمل ماں کو صحیح اور اچھی غذا دینے کا مقصد اور فائدہ نہ صرف جنین کو مناسب غذا پہنچانا اور تندرستی بخشنا ہے بلکہ ماں کی چھاتی میں اچھے قسم اور مناسب مقدار میں دودھ پیدا کرنا بھی ہے، جو آگے چل کر بچے کی بہترین غذا بنتی ہے۔

دورانِ رضاعت ماں اور بچے کی غذائیں

دورانِ رضاعت ماں کو صحیح اور مناسب غذا کی برابر ضرورت رہتی ہے تاکہ سینہ میں اچھے قسم کے دودھ کی فراوانی ہو۔ ایسے دودھ میں اچھی غذائیت ہوتی ہے جو بچے کے لیے بہت ضروری ہے۔ رضاعت کے دوران حمل کے مقابلہ ماں کو زیادہ غذا کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس زمانہ میں ماں کو خوراک میں دودھ کی مقدار بڑھا دینا ہے۔ رضاعت کے دوران پروٹین، وٹامن اے تھایامین، ربوفلاوین اور کیلاری کی ضرورت حمل کے ایام سے زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ کیلسیم، لوہا، اسکوربک ایسڈ اور وٹامن ڈی کی اتنی ہی مقدار کافی ہوتی ہے۔ شیر آوری کے دوران غذا مرغوب اور لذیذ ہونا چاہیے جو مختلف طریقوں سے ضروری اجزا کو خوراک میں شامل کرکے تیار کی جاسکتی ہے۔

پیدائش کے دو دن بعد تک بچے کا وزن کچھ گھٹتا ہے جب غذا پوری ملنے لگتی ہے تو ایک ہفتہ میں یہ کمی پوری ہوجاتی ہے اس کے بعد پانچ سے فی ہفتہ سات آونس کا اضافہ ہوتا ہے۔

رضاعت (Feeding) دو قسم کی ہوتی ہے۔ پستانی (Breast Feeding) اور مصنوعی (Bottle Feeding)۔ ماں کا بچے کو دودھ پلانا ہی صحیح پستانی رضاعت ہے۔ لیکن اگر ماں کے علاوہ کسی دوسرے عورت کا دودھ پلایا جائے تو بھی وہ مصنوعی رضاعت نہ ہوگی۔ البتہ بوتل کے ذریعہ حیوانی یا کیمیادی دودھ پلانا مصنوعی رضاعت ہے۔ یہ بات بالکل طے ہے کہ بچہ کے لیے ماں کے دودھ سے بہتر کوئی غذا نہیں ہوسکتی۔ خود ماں کو بھی رضاعت سے فائدے ہوتے ہیں، جن کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔ لیکن آج کل جدید خیال کی عورتیں رضاعت کو صحت کے لیے مضر خیال کرتی ہیں۔ یہ غلط خیال ہے۔ صرف چند حالتیں ایسی ہیں جن میں رضاعت مناسب نہیں ہوتی جیسے شدید فقر الدم سل ودق، شدید قلبی امراض، جنون، جذام، حمل اور بچہ کو دودھ موافق نہ آنا جس کے نتیجہ میں مسلسل بدہضمی ہوتی ہے اور بچہ دبلا ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ پستانی زخموں یا دیگر امراض میں صرف وقتی طور پر رضاعت بند کی جاسکتی ہے۔ اگر ماں کا دودھ ممکن نہ ہو

توانا کا دودھ نعم البدل ہوسکتا ہے۔اور جب یہ بھی ممکن نہ ہو تو گائے کا دودھ سب سے اچھا ہے۔کیونکہ وہ اپنے کیمیاوی اجزا کے لحاظ سے انسانی دودھ سے بہت قریب ہوتا ہے۔مناسب ہے اگر گائے کے دودھ کو انسانی دودھ جیسا کرلیا جائے۔گائے کے دودھ میں پنیر کے اجزا زیادہ اور چکنائی وشکر کے اجزا انسانی دودھ کے مقابلہ کم ہوتے ہیں۔اس کو انسانی دودھ کی طرح بنانے کا طریقہ یہ ہے کہ اس میں پانی، کریم، اور لبنی شکر(Lactose) شامل کردیا جائے۔کیمیاوی دودھ جو سفوف کی شکل میں دستیاب ہوتے ہیں، طبی نقطۂ نظر سے رضاعت کے لیے سب سے آخر درجہ میں ہیں، حالانکہ ان کا رواج بہت بڑھتا جارہا ہے۔اس میں سہولت اور کسی حد تک جراثیمی سرایت کا تحفظ تو ضرور ہے، ان کی افادی حیثیت قابل ترجیح نہیں ہے اس لیے ان کو بدرجہ مجبوری استعمال کرنا چاہیے۔

پستانی رضاعت (Breast Feeding) کی سب سے بڑی خاصیت یہ ہے کہ وہ جراثیم سے بالکل پاک ہوتا ہے اگر چھاتیوں کو کسی مناسب محلول سے صاف کرلیا جائے تو جراثیم کے سرایت ہونے کا کوئی اندیشہ نہیں رہتا۔ انسانی دودھ رقیق اور سفید نیلگوں ہوتا ہے لیکن اگر پستانوں سے نچوڑا جائے تو کسی قدر زردی مائل بھی ہوسکتا ہے۔اس کی مقدار مختلف عورتوں میں الگ ہوتی ہے۔عموماً ولادت کے تیسرے روز پستانوں میں تمدد (Extension) پیدا ہوکر اس کا افراز شروع ہو جاتا ہے۔پہلی مرتبہ کے دودھ میں کسی قدر پیوسی یا کھیس(Colastrium) ہوتی ہے جس کا قدرتی فعل یہ ہوتا ہے کہ بچہ کو ایک یا دو دست آکر پیٹ صاف ہوجاتا ہے۔

دودھ کی افراط میں ماں کی غذا کو اتنا دخل نہیں جتنا بچے کے چوسنے کو ہے۔معمولی مناسب غذا بھی بکثرت دودھ کا افراز کرسکتی ہے بشرطیکہ بچہ کا چوسنا کمزور نہ ہو۔اس لیے ابتدائی تحریک کے لیے بچہ کو کسی قدر بھوکا اور پیاسا رکھنا زیادہ مناسب ہوتا ہے۔اس کے علاوہ نظام اعصاب کا بھی اس سے بڑا تعلق ہے۔اس لیے جذبات کا اثر افراز شیر پر حیرت انگیز ہوتا ہے۔جو عورتیں بچے سے زیادہ انس کرتی اور اپنا دودھ پلانا چاہتی ہیں، ان میں دودھ کی پیداوار زیادہ ہوتی ہے جن کا مادری جذبہ کمزور ہوتا ہے ان میں دودھ نہ صرف کم بلکہ بعض اوقات بالکل خشک ہوجاتا ہے۔دودھ کو صحیح طور پر حاصل کرنے کے لیے مناسب غذا، رضاعت کے لیے مناسب وقفہ خوراک میں سیال غذاؤں کی مقدار زیادہ ہونا چاہیے۔پھل، سبزیاں اور حیاتیاتی اجزا جیسے پروٹین والی غذائیں زیادہ بہتر ہیں۔تیز مصالحے دار چیزوں سے پرہیز کرنا چاہیے۔معمولی زندگی جو حفظانِ صحت کی عام ہدایات کے مطابق ہو گزارنا چاہیے۔

دودھ پلانے سے قبل پستانوں کے سرے جوش دیے ہوئے نیم گرم پانی یا بورک لوشن سے صاف کرلیے جائیں اور بعد میں پھر صاف کرکے مطہر وجاذب روئی کی چھوٹی سی گدی ان پر رکھ دی جائے۔سوائے ابتدائی مدت کے جس میں زچہ کے لیے بیٹھنا مناسب نہیں، بچہ کو بیٹھ کرہی دودھ پلانا زیادہ مناسب ہے۔

بچپن کی غذائیں

بچپن کے زمانے کو کئی حصوں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔ان کی غذائیں اطبا کے مشورہ سے طے کرنا چاہیے۔جب بچہ ماں کا دودھ پیتا ہے اس وقت اس کو جو بھی غذا دینی ہو وہ غذا ماں کو کھانا چاہیے تاکہ اس کا مفید جز ماں کے دودھ میں شامل ہوکر بچے کے جسم میں پہنچے۔جب بچہ شیشی سے دودھ پینا شروع کرے اس وقت ضروری اجزا اطبا کے مشورہ سے اس کے دودھ میں شامل کردینا چاہیے۔یہ حالت عام طور پر ایک سال یا زیادہ سے زیادہ دوسال تک رہتی ہے۔اس کے بعد بچہ اپنے گھر والوں کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھ کر کھانا شروع کرتا ہے۔ہر گھر اور خاندان کی عادت غذا کے مطابق اسی خوراک میں ایسی غذائیں شامل کرنا چاہیے جو بچے کی نشوونما کے لیے مفید ہوں۔کھانے میں وٹامن ڈی ملا دودھ، انڈے، گوشت، ہری اور زرد ترکاریاں، پھل، گاجر، نارنگی (اسکوربک ایسڈ کے لیے)، روٹی اور دوسرے اناج استعمال کرنا چاہیے۔

پانچ سال کی عمر کے بعد بچے کی نشوونما بہت تیزی سے ہوتی ہے۔وہ کھیل کود میں توانائی کا استعمال بھی بہت کرتا ہے۔اس لیے اس کو توانائی (کیلاری) والی غذائیں زیادہ دینا چاہیے۔دس سال کی عمر کے بچے کی غذا ایک مرد کی غذا سے کم نہیں ہے۔اس وقت اس کو کیلاری، پروٹین، تھایامن، ربوفلیون، اسکوربک ایسڈ کیلسیم وغیرہ بہت مقدار میں ملنا چاہیے۔اس وقت اس کی غذا اور خوراک کا خیال رکھنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا ایک حاملہ یا دودھ پلانے والی عورت کی غذا کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

اسکول جانے والے بچوں کی عادات غذا اسکول نہ جانے والوں سے مختلف ہوتی ہیں۔دوسال کی عمر کے بعد بچہ غذا کو سمجھنا شروع کردیتا ہے۔اس کو ان غذاؤں سے واقفیت شروع ہوتی ہے، جو تمام عمر اس کو استعمال کرنا ہیں۔لیکن لڑکپن میں بچوں کا رجحان غذا کی طرف کم ہوتا ہے اس کو کھانے کا شوق نہیں ہوتا۔اس کی دلچسپی کھیل کود اور گھومنے میں زیادہ ہوتی ہے، جس کی وجہ سے غذا کی طرف سے اس کی توجہ ہٹی رہتی ہے۔یہ بھوک کی کمی کسی بیماری یا کمزوری کی وجہ سے نہیں بلکہ ایک فطری بات ہے۔

اس کے کھانے کی طرف بے رغبتی سے والدین متفکر ہوتے ہیں لیکن یہ کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔ اسکول جانے والے بچوں کی خوراک میں، دودھ، گوشت، سبزیاں، پھل اور اناج شامل ہونا چاہیے۔

نوبلوغ کی غذائیں۔ بالغ ہونے پر انسان میں بہت تبدیلی آتی ہے۔ لڑکوں میں بلوغ کی خاص پہچان نہیں ہے لیکن لڑکیوں میں یہ واضح ہوتی ہے۔ اس عمر میں جسم اور اس کے اعضا کی نشو ونما بھی خوب ہوتی ہے اور ساتھ ہی جسمانی محنت بھی زیادہ ہوتی ہے۔ اس لیے توانائی اور پروٹین کی بہت ضرورت ہے۔ ہڈیوں کی ساخت اور مضبوطی کے لیے کیلشیم، فاسفورس اور وٹامن ڈی کی بھی مناسب مقدار ضروری ہے۔ لڑکیوں کو لڑکوں کے مقابلہ زیادہ لوہے والی غذائیں چاہیے کیونکہ ہر ماہ ان کا کافی خون نکل جاتا ہے۔ اگر خوراک میں لوہے کی کمی رہی تو انیمیا ہوجاتا ہے۔ لڑکے چونکہ کھیل کود اور جسمانی محنت زیادہ کرتے ہیں۔ اس لیے ایک ہی عمر کی لڑکیوں سے مقابلہ لڑکوں کو زیادہ توانائی اور پروٹین چاہیے۔ اسی طرح دوسرے اجزا کی بھی مناسب مقدار ضروری ہے جس کی تفصیل آخر میں دیے گئے روزانہ خوراک کے مجوزہ نقشہ سے معلوم ہوسکتی ہے۔

جوانی کی غذائیں: جوانی میں انسان کی نشو ونما تکمیل کو پہنچ چکی ہوتی ہے۔ اس کو برقرار رکھنے کے لیے مناسب غذا کی ضرورت ہے۔ بچپن اور نوبلوغ کی غذائیں جوانی میں کام دیتی ہیں۔ ان کے فوائد اور اثرات کا اندازہ جوانی میں ہوتا ہے۔ پیشہ کے اعتبار سے کچھ لوگ کاہل، کچھ معمولی محنت کرنے والے اور کچھ بہت محنتی ہوتے ہیں۔ اسی لحاظ سے ان کی غذا اور توانائی کی ضرورت کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ مردوں اور عورتوں کی غذاؤں اور ان کی مقدار میں کافی فرق ہوتا ہے۔ مرد کام اور محنت کرتے ہیں۔ ان کو توانائی کی زیادہ ضرورت ہے۔ عورتیں حاملہ ہوتی ہیں پھر دودھ پلاتی ہیں ان کو پروٹین، لوہا، کیلشیم، فاسفورس، وٹامن ڈی وغیرہ کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔

بڑھاپے کی غذائیں: بڑھاپا عموماً 55 سال کی عمر کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔ اکثر بوڑھوں کی غذا کے بارے میں رغبت ان کی ضرورت کی غذاؤں سے مختلف ہوتی ہے۔ بہتوں کو مٹھائی کھانے کا چسکا پڑ جاتا ہے۔ لیکن اس کے توازن کے لیے دوسری غذائیں جن سے وٹامن بی کمپلکس ملے نہیں کھاتے جس سے کاربوہائیڈریٹ کی زیادتی ہو جاتی ہے۔ بہت سے معمر جن کے یہاں دوسرا کام کرنے والا نہیں ہوتا مجبوراً ایسی غذائیں کھانا شروع کر دیتے ہیں جن کو پکانا نہ پڑے، مثلاً ہری اور زرد سبزیاں، پھل اور دودھ وغیرہ۔ ان کا استعمال اکثر غیر مفید ثابت ہوتا ہے۔ بڑھاپے کی تکلیف سے بچنے کے لیے مناسب غذا استعمال کرنا چاہیے، جو زود ہضم ہو اور جسم کو حاصل غذاؤں کی تحلیل میں مدد دے۔ جسم کی حرکت اور پھرتی میں بھی کمی ہو جاتی ہے جس سے توانائی کی ضرورت کم پڑتی ہے۔ اس عمر میں زیادہ کھانا مضر اور بیماریوں کا باعث ہے۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ جن لوگوں کی عادت کم کھانے کی ہوتی ہے وہ بہت سی بیماریوں سے محفوظ رہتے ہیں۔ اس عمر میں کم توانائی کی غذاؤں کے استعمال سے انحطاطی امراض، جیسے دل کی بیماری، خون کے دباؤ کی زیادتی، فربہی وغیرہ میں کمی رہتی ہے۔ یہ تمام انحطاطی امراض فربہی سے پیدا ہوتے ہیں ان کی وجہ خوراک کی کثرت ہے۔ خوراک کے لیے پروٹین کی مقدار ہر عمر میں تقریباً یکساں رہتی ہے یعنی جسم کے ایک کلوگرام وزن پر ایک گرام پروٹین۔ لیکن کئی وجود سے بڑھاپے میں خوراک میں پروٹین کی کمی ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ بڑھاپے میں جوانی کے مقابلہ کیلشیم کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے اس کی وجہ دراصل ہڈیوں کا گھل کر ضائع ہونا اور ان کی مرمت ہونا ہے۔ اس کے علاوہ معدہ میں تیزابیت کی کمی اور جگر اور بانقراس کی خرابی سے کیلشیم کی انجذاب میں کمی آجاتی ہے۔ اس عمر میں وٹامن بی کمپلکس کی بھی ضرورت ہے۔

(**بحوالہ: ہماری غذا، شکیل احمد، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، 1982**)

ثناء رحمٰن

صنفِ نازک کا فطری اثاثہ
حُسن

حسن آواز میں ہو یا چہرے میں، تاج محل میں ہو یا کشمیر کی حسین وادیوں میں، شاعر کی غزل میں ہو یا پھر مصوّر کی تصویر میں۔ حسن بہ ہر حال حسن ہے اور یہ ہر جگہ سر چڑھ کر بولتا ہے۔ حسن کا تعلق فطری اعتبار سے ہر اس شئے سے ہے جس کو انسانی آنکھ خوبصورت دیکھنا چاہتی ہے۔ اسی لیے صنفِ نازک جو اس کائنات کا سب سے زیادہ حسین و دلفریب وجود ہے۔ قدرت نے یہ وصف اس کے اندر کوٹ کوٹ کر بھرا ہے اس لیے وہ حسن کو اپنا فطری اثاثہ سمجھتی ہے۔ ابتدائے آفرینش سے آج تک روئے زمین پر کوئی ایسی خاتون نہ ہوئی جس نے خود کو حسین نہ سمجھا ہو۔ خواہ اس کے اس فہم و دانست کی جسم کے خدوخال نفی ہی کیوں نہ کرتے ہوں۔

قدرت کی پیدا کی ہوئی ایک ایک چیز پر نظر ڈالیے قدم قدم پر آپ کو حسن کی جلوہ آرائیاں اور کرشمہ سازیاں نظر آئیں گی۔ بہشتی چڑیاں اپنے حسین پنکھوں میں، بلبل ہزار داستاں اپنی خوبصورت آواز میں، مور اپنے پروں کی نورانی پوشاک میں، رنگین تتلیاں اپنے نفیس بازوؤں میں، پھول اپنی شادابی اور بھینی بھینی خوشبو میں کیسی دلفریب بہار دکھاتے ہیں۔ یہ سب حسن کی جلوہ سامانیاں نہیں تو اور کیا ہیں؟ اور پھر ان سب سے بڑھ کر انسان بالخصوص صنفِ نازک کا وجود ہے۔ جس کو خدا نے دلکشی و رعنائی کا مجموعہ بنا کر کائنات کا سب سے حسین و دلکش وجود بنا دیا ہے اور اس ہستی سے ہی کائنات کے ذرّے ذرّے کو حسن و زیبائش عطا کی ہے۔ بقول اقبال ؎

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ

نسوانی حسن کیا ہے؟ اس کی اجمالی تعریف ''تناسبِ اعضاء'' سے کی جا سکتی ہے۔ انسان کے خوبصورت چہرے میں شادابی رنگ، خدوخال،

زلف و ابرو، لب و دہن، رخسار و پیشانی، چشم و پلک اور کان و ناک کے ساتھ ہی اس کے ہاتھوں کی بناوٹ، کلائیوں کی خوبصورتی، پیروں کی دلکشی، رفتار کی نزاکت اور آواز و ادا کو بھی زبردست دخل حاصل ہے۔ دراصل چہرے کے خدوخال اور اعضاء کی موزونیت کو ہی حسن کہا جاتا ہے اور یہی فطری طور پر دیکھنے والے کو متاثر کرتے ہیں، اس کا دل موہ لیتے ہیں اور اس کو اپنا گرویدہ بنا لیتے ہیں۔ یوں تو انسان کا پورا جسم ہی حسن و خوبصورتی کا مرکز ہوا کرتا ہے۔ مگر حقیقی معنوں میں اس کا مظہر چہرا ہوتا ہے۔ چونکہ ظاہری حسن کا دارو مدار چہرے کی خوبصورتی و دلکشی پر ہی ہے۔ اسی لیے ہمیں اپنے چہرے پر خصوصی توجہ دینی چاہیے اور اس کو سجانے سنوارنے میں کوئی کوتاہی اور کوئی کسر نہ اٹھا رکھنی چاہیے۔

میک اپ، بناؤ سنگھار اور مصنوعی طور پر جسم و چہرے کو بنانا و سنوارنا گرچہ ایک مفید و موثر عمل ہے مگر اس میں سخت احتیاط اور توجہ کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں تھوڑی سی بھی لاپرواہی اور عدم توجہی نقصان دہ اور مضر ہو سکتی ہے۔ کچھ لڑکیاں فیشن اور بیوٹی کے نام پر بازار میں فروخت ہونے والے سستے اور غیر معیاری روغنیات، لوشن، کریم، پاؤڈر اور خوشبو دار صابن و شیمپو وغیرہ استعمال کرنے کو چہرے کی سجاوٹ کا نام دیا کرتی ہیں۔ اس سلسلے میں قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ ہمیں حسن کی حصولیابی مضرِ صحت اشیاء سے نہیں بلکہ قدرت کے انمول خزانوں سے حاصل کرنی چاہیے جو قدرت نے دودھ، گھی، مکھن، نباتات، پھل، سبزیوں، قدرتی تیل و روغن اور صحت بخش غذا و مغزیات کی شکل میں اپنی بیش بہا نعمتوں کے اندر چھپا رکھا ہے۔ ہم ان چیزوں کو استعمال کر کے اپنے حسن و شباب کو محفوظ رکھ سکتے ہیں اور مزید حسین و جمیل بننے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔

یہ ٹھیک ہے کہ حسن قدرت کی طرف سے عطا ہوتا ہے۔ مگر اس کو برقرار رکھنا، اس میں نکھار لانا اور اس کو مزید سجانا و سنوارنا یہ تو ہماری ہی ذمہ داری ہے۔ اسی لیے ہماری بہنوں کو چاہیے کہ قدرت نے انھیں حسن و جمال کی شکل میں جو دلکش و خوبصورتی کا تحفہ عطا کیا ہے اس کو زمانے کی کدورتوں اور وقت کے تند و تیز جھونکوں، موسم کی بے اعتدالیوں اور حالات کی ستم ظریفیوں سے محفوظ رکھنے میں کسی طرح کی غفلت و کوتاہی نہ برتیں۔ نشہ آور اور مضرِ صحت اشیاء کا قطعی استعمال نہ کریں۔ غذا اور دوا کے ساتھ ہی جلد کے نکھار کے لیے بھی ایلکحل، اسپرٹ اور تیزابیت سے بھرپور لیکوئیڈ سے پرہیز کرتے ہوئے قدرتی نباتات اور روغن و گلاب، گلسرین، لیموں اور دودھ ملائی کا استعمال کر کے جلد کو ملائم و دلکش بنائیں۔ تا کہ آپ کی ذات مکمل طور پر دلآویز و دلکش ہونے کے ساتھ ہی پوری طرح حسن و خوبصورتی کا مجموعہ بھی نظر آئے۔

□□□

Sana Rahman
Allama Iqbal Street
Miyan Sarai
Sambhal-244302 (U.P)

تاثرات: نگر نگر سے

''خواتین دنیا'' جون 2020 نظر نواز ہوا۔ یہ خواتین کی نمائندگی کرنے والا ایسا معیاری رسالہ ہے جس میں عورتوں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو ذہن میں رکھ کر مضامین اور افسانوں کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ ماہنامہ ''خواتین دنیا'' ایک ایسا رسالہ ہے جس میں خواتین کی دلچسپی سے متعلق بہت سا مواد موجود ہوتا ہے۔ ادبی مضامین ، کہانیاں، شاعری خواتین کی خبریں اور لذیذ پکوان کے ساتھ ساتھ ان کے حسن اور صحت سے متعلق معلومات بھی مہیا کرائی جاتی ہے۔ ڈاکٹر رینو بہل کی کہانی ''دل میں رب بستا ہے'' بہت اچھی لگی۔ اس کہانی میں ایک لڑکی اپنے باپ کی موت سے زیادہ ان ہزار لوگوں کے مرنے پر افسوس کرتی ہے جو کم عمری میں اس دنیا سے چل بسے۔ وہ کہتی ہے کہ میرے پاپا تو اپنی طبعی عمر گزار کر چلے گئے مگر ان لوگوں کا کیا جو اس نامراد وائرس کا شکار ہو کر اپنوں سے جدا ہو گئے ہیں۔ دوسری کہانی درخشاں پروین کی 'بیٹی' ہے۔ جو لوگ بیٹی کے پیدا ہونے پر افسوس کرتے ہیں ان کے لیے یہ کہانی ایک سبق ہے کیونکہ بیٹیاں بوجھ نہیں بلکہ وہ بھی بیٹوں کی طرح اپنے ماں باپ کا سہارا بنتی ہیں اور اپنی ذمہ داریوں کو بخوبی نبھاتی ہیں۔ ثنا غزل کا مضمون ''پروفیسر محمد انصار اللہ بحیثیت محقق'' بہت ہی عمدہ اور معلوماتی ہے۔ اس مضمون کو پڑھ کر لگا کہ محمد انصار اللہ کا شمار اردو کے نامور محققین میں ضرور کیا جانا چاہیے۔ ایک ایسا محقق جو ابھی تک لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہے۔ محمد انصار اللہ نے اردو اصناف پر کام کیا ہے۔ قواعد سے متعلق ان کی کتاب ''اردو صرف'' اور ''اردو نحو'' آسان لفظوں میں بچوں کے لیے تصنیف کی۔ اس کے علاوہ تحقیق و تدوین کا کام بھی کیا۔ ان کی کئی کتابیں کارآمد اور مفید ہیں بس انھیں منظر عام پر لانے کی ضرورت ہے۔ میری نیک خواہشات خواتین دنیا سے وابستہ ہیں۔

ادم فاز، 4/273 اندرا نگر شکلا گنج، کان پور

ماہنامہ ''خواتین دنیا'' جولائی 2020 کا شمارہ نظر سے گزرا۔ یہ خوب صورت رسالہ خواتین کے احساسات اور مسائل کی بہترین ترجمانی کرتا ہے۔ شاعرات کے اشعار، گھر گرہستی، صحت اور حسن کی نگہداشت جیسے موضوعات کے انتخاب سے اس کی انفرادیت کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ ''مشعل'' کے عنوان سے لکھا گیا اداریہ اس لیے اہم ہے کہ اس میں کورونا کے بحران سے ادب اور انسانی زندگی میں آنے والی تبدیلیوں کے امکانات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

شمارے کے تمام مشمولات اہم اور دلچسپ ہیں لیکن ڈاکٹر محمد دانش غنی کا مضمون ''بانو سرتاج کی کہانیاں'' اس لیے اہم ہے کہ انھوں نے بچوں کے ادب پر بانو سرتاج کی لکھی گئی کہانیوں سے متعارف کرایا اور یہ بھی بتایا کہ وہ ایک اچھی افسانہ نگار اور مزاح نگار ہونے کے ساتھ ساتھ بچوں کے ادب پر لکھنے والی کامیاب خاتون ہیں۔ ڈاکٹر محمد نہال افروز کا مضمون

''مہرالنساپرویز کی کہانیوں میں نسائی مسائل کی عکاسی'' اس لیے پسند آیا کہ انھوں نے ہندی کی مشہور فکشن نگار مہرالنسا پرویز سے متعارف کرایا اور ان کی کہانیوں کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے خواتین کے مسائل کا بھی ذکر کیا ہے۔ دعا گو ہوں کہ یہ رسالہ نت نئی کامیابیوں سے ہم کنار ہوتا رہے۔

محمد عامل بدایونی، ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

'خواتین دنیا' مئی 2020 موصول ہوا۔ یہ خواتین کی نمائندگی کرنے کے ساتھ ساتھ خواتین میں بیداری پیدا کرنے اور ان کو اپنا طرز حیات تبدیل کرنے میں بھی اہم رول ادا کرتا ہے۔ اس رسالے میں خواتین سے متعلق بہت سے کالم ہیں جن میں ادبی مضامین کے ساتھ ساتھ صحت، آرائش وزیبائش اور لذیذ پکوان جیسے کالم اہمیت کے حامل ہیں۔ خواتین خبرنامہ اس لیے اہم ہے کہ اس میں ہر مہینے خواتین سے متعلق سرگرمیوں پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ خبرنامہ کو پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ ہماری خواتین بھی اب کافی حد تک فعال ہو چکی ہیں اور ان کے اندر بڑھتا اعتماد ان کی دشوار گزار راہوں کو مزید آسان کرے گا۔

آفرین خانم، شاہجہاں پور، یوپی

'خواتین دنیا' جون 2020 نظر نواز ہوا۔ سرورق پسند آیا۔ اداریہ میں مدیر اعلیٰ کے خیالات کافی اہم ہیں۔ شخصیت کے ذیل میں آمنہ ابوالحسن کے حوالے سے مضمون دیا گیا ہے جس میں مضمون نگار نے ان کے افسانوں کے حوالے سے مضمون میں بحث کی ہے۔ شاعرات کے منتخب اشعار عمدہ ہیں 'محمد قلی قطب شاہ اور ان کی بارہ پیاریاں' کے تحت ڈاکٹر تسنیم بانو نے محمد قلی قطب شاہ کے دیوان سے وہ اشعار نقل کیے ہیں جس میں قلی قطب شاہ نے اپنی بارہ پیاریوں کا اپنے دیوان میں جا بجا تذکرہ کیا ہے۔ پروفیسر محمد انصار اللہ کو محقق کی حیثیت سے مضمون میں شامل کیا گیا ہے۔ کہانیوں میں 'دل میں رب بستا' بہت پسند آئی۔ آج ہم جس بحران سے گزر رہے ہیں افسانہ نگار نے اس افسانہ میں اس کیفیت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے جس میں وہ کامیاب بھی ہوئی ہیں۔ لذیذ پکوان میں گول گپوں کی ریسیپی پسند آئی۔ صحت کے تحت ایئر فریئر کے حوالے سے مضمون موجود ہے۔ ایئر فیرئر ہماری صحت کے لیے کتنا مفید ہے اور اس کا استعمال کیسے کرنا چاہیے ان باتوں پر توجہ دی گئی ہے۔ خواتین خبرنامہ بھی اچھا لگا۔

حمیدہ بیگم، پھلواری شریف، پٹنہ، بہار

خواتین دنیا جون 2020 نظر نواز ہوا۔ کور پیج بہت دیدہ زیب اور پرکشش ہے۔ اس شمارے میں کل سات مضامین دیے گئے ہیں۔ ڈاکٹر سیدہ نرجس فاطمہ کا مضمون 'شہناز کنول کے افسانوں کا تنقیدی منظر نامہ' بہت پسند آیا۔ مضمون نگار نے مصنفہ کے افسانوں کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ 'سیوان ضلع کی خواتین تخلیق کار' ڈاکٹر ارشاد احمد کے ذریعے لکھا گیا مضمون ہے، جس میں انھوں نے سیوان ضلع سے تعلق رکھنے والی خواتین تخلیق کاروں کی تخلیقات کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ 'زندگی کا پیکیج' شبنم رضوی کی کہانی پسند آئی۔ درخشاں پروین کا افسانہ 'بیٹی' بھی پسند آیا۔ دعا گو ہوں کہ یہ رسالہ کامیابی و کامرانی سے ہمیشہ ہم کنار ہوتا رہے۔

رونق آرا، مظفر پور، بہار

'خواتین دنیا' جون 2020 کا شمارہ کونسل کی ویب سائٹس کے ذریعے مطالعے میں رہا۔ سابق شماروں کی طرح یہ شمارہ بھی اپنے اندر بہت سی خوبیاں سمیٹے ہوئے ہے اس شمارے کا ہر مضمون توجہ طلب ہے۔ اس وقت جبکہ پوری دنیا عالمی وبا کے بحران سے گزر رہی ہے ایسے میں کس طرح اپنے آپ کو محفوظ رکھا جا سکتا ہے اس پر بھی توجہ مبذول کرائی گئی ہے۔ کہانیوں کا انتخاب بھی عمدہ اور معیاری ہے۔ حسن سخن، باورچی خانہ، صحت، آرائش وزیبائش، تاثرات اور خواتین خبرنامہ یہ ایسے کالم ہیں جن میں خواتین کی دلچسپی ہمیشہ ہی رہتی ہے۔

شبنم خاتون، اکولہ، مہاراشٹر

'خواتین دنیا' جون 2020 کا شمارہ پڑھنے کا موقع ملا۔ گذشتہ شماروں کی طرح یہ شمارہ بھی بہت معیاری تھا۔ اس شمارے میں بہت سے ایسے مضامین تھے جن کو پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہوا۔ خصوصی طور پر سیوان ضلع کی خواتین تخلیق کاروں نے بہت متاثر کیا۔ 'اردو کی غزلیہ شاعری میں طنزیاتی و مضحکاتی عنصر' مضمون بھی بہت پسند آیا۔ افسانوں کا انتخاب بھی لاجواب ہے۔ چاروں ہی افسانے بہت اچھے لگے۔ حسن سخن میں شہناز فاطمہ صدیقی صاحبہ کی غزلیں بھی لائق توجہ ہیں۔

خواتین دنیا کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں خواتین سے متعلق مواد موجود ہوتا ہے۔ اس خوبصورت اور معیاری رسالے میں بہت سے ایسے کالم بھی ہیں جو خواتین کے لیے مختص ہیں، آرائش وزیبائش سے لے کر خواتین خبرنامہ کو اس میں ترجیحی طور پر شامل کیا گیا ہے۔

اس رسالے میں خواتین سے متعلق مضامین شائع کیے جاتے ہیں۔ اس شمارے کا اداریہ توجہ طلب ہے۔ شاعرات کے کالم نے بھی بہت متاثر کیا۔ جون کے شمارے نے میرے علم میں بہت اضافہ کیا ہے۔ دعا کرتی ہوں کہ یہ رسالہ اسی طرح اپنی آب و تاب قائم رکھے۔

ثانیہ رحمٰن، بٹلہ ہاؤس، نئی دہلی

اسرو میں تعینات امروہہ کی خوشبو مرزا سائنٹسٹ ایس ایف رینک سے سرفراز

اسرو میں بطور سائنٹسٹ خدمات انجام دینے والی امروہہ کی خوشبو

مرزا کی ادارہ جاتی ترقی پر ادبی تنظیم انجمن ترقی اردو و تعلیمی اور سماجی خدمات انجام دینے والی سرگرم تنظیم ہاشمی ایجوکیشنل گروپ نے خوشبو مرزا و اہل خانہ کو مبارک باد پیش کی ہے۔ بتاتے چلیں کہ اسرو میں تعینات سائنٹسٹوں کو ان کی ذہانت اور کارکردگی کے اعتبار سے رینک فراہم کیے جاتے ہیں خوشبو مرزا کو ترقی دیتے ہوئے ادارہ نے سائنٹسٹ ایس ایف رینک سے سرفراز کیا ہے جو ادارہ کے بہترین رینکس میں شمار کیا جاتا ہے جانکاری کے مطابق اسرو میں ترقی کے بعد خوشبو مرزا کو حاصل ہوئی تازہ رینک مساوی ڈائریکٹر کے بھی مانی جاتی ہے۔

انڈین اسپیس ریسرچ آرگنائزیشن (اسرو) میں بطور سائنٹسٹ تعینات امروہہ کی بیٹی اور نوجوانوں کے لیے مشعل راہ خوشبو مرزا نے ایک مرتبہ پھر امروہہ کا نام روشن کیا ہے بطور سائنٹسٹ اسرو میں تعینات خوشبو مرزا کی ترقی کی گئی ہے پرموشن کے بعد اب خوشبو مرزا سائنٹسٹ ایس ایف بن گئیں ہیں۔ قابل ذکر ہے کہ اسرو کے قوانین کے مطابق بہترین و نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی محنت اور تحقیق میں نئے تجربات کرنے والے سائنٹسٹ کو رینک کے ذریعے پرموٹ کیا جاتا ہے حالیہ ترقی کے بعد اب خوشبو مرزا اسرو سائنٹسٹ ایس ایف ہوں گی۔ دوسری جانب خوشبو مرزا کے آبائی وطن امروہہ میں ان کی ترقی کی خبر پہنچتے ہی یہاں پر خوشی کا ماحول دیکھنے کو مل رہا ہے مختلف سماجی و تعلیمی تنظیموں کے علاوہ ادبی تنظیموں سے وابستہ اشخاص نے خوشبو کے گھر پہنچ ان کی والدہ و بھائی خوشتر مرزا کو خوشبو مرزا کی ترقی کی مبارک باد پیش کی ہے۔

چیرمین ہاشمی ایجوکیشنل گروپ و نائب صدر انجمن ترقی اردو اتر پردیش سرکردہ سماجی کارکن ڈاکٹر سراج الدین ہاشمی نے خوشبو مرزا کو مبارک باد پیش کرتے ہوئے کہا کہ بہت کم عمری میں اسرو جیسے معتبر ادارہ میں مکمل ذمہ داری کے ساتھ اپنی خدمات انجام دینے والی امروہہ کی بیٹی خوشبو مرزا دور حاضر میں امروہہ کی شناخت بن چکی ہے۔ والدہ کی کڑی محنت اور اہل خانہ کے مکمل اعتماد و ساتھ نے خوشبو مرزا کی کامیابی میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ نوجوان نسل کو خوشبو جیسی بیٹیوں سے سیکھنا چاہیے کہ اگر ارادے مضبوط ہوں تو منزلیں آپ کا خود انتظار کرتی ہیں۔ خوشبو مرزا آج اپنی قابلیت کے بوتے روشن ستارہ بن چکی ہے۔ تعلیم ہی ترقی کا واحد راستہ ہے ضرورت اس بات کی ہے کہ فروغ تعلیم کے ساتھ بامقصد تعلیم حاصل کی جائے اپنے مقاصد طے کیے جائیں اور اسی سمت اپنے تعلیمی سفر پر گامزن ہوا جائے۔ (سچ کی آواز، 25 جون 2020)

آخر میں ڈاکٹر ہاشمی نے خوشبو مرزا ان کی والدہ اور ان کے بھائی چودھری خوشتر مرزا کو مبارک باد دیتے ہوئے خوشی کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر ہاشمی کے علاوہ اردو ادب سوسائٹی سے کوثر علی عباس و تمام عہدہ داران و ممبران امروہہ سے سیّد محبوب حسین زیدی و ٹیم مسلم کمیٹی سے صدر نسیم احمد خان اتحاد ملت امروہہ سے آصف قریشی وغیرہ نے بھی خوشبو مرزا کی کامیابی پر ان کو و اہل خانہ کو مبارک باد پیش کی ہے۔

وسیمہ شیخ ڈپٹی کلکٹر کے عہدے کے لیے منتخب

سچی لگن سے کی جانی والی کوششیں کبھی رائیگاں نہیں جاتیں۔ اس کی ایک مثال ان دنوں ناندیڑ کی ہونہار طالبہ وسیمہ شیخ نے پیش کی ہے۔ وسیمہ شیخ نے مہاراشٹر پبلک سروس کمیشن کے امتحان میں شاندار کامیابی حاصل کرتے ہوئے لڑکیوں میں تیسرا رینک حاصل کیا ہے اور ڈپٹی کلکٹر کے عہدے کے لیے منتخب کی گئی ہیں۔

وسیمہ شیخ کا تعلق ناندیڑ ضلع کے عثمان نگر تعلقہ میں واقع ایک چھوٹے سے گاؤں جوشی سانگوی سے ہے۔ وہ ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد ذہنی طور پر معذور تھے جس کی وجہ سے والدہ کھیت میں مزدوری کیا کرتی تھیں۔ جبکہ بھائی آٹو چلا کر گھر کے اخراجات اور بہن کی تعلیمی ضروریات پوری کیا کرتے تھے۔ وسائل کی کمی، غربت اور پسماندگی کے باوجود وسیمہ شیخ نے ہمت نہیں ہاری اور بغیر کسی کوچنگ کے اپنی ذاتی محنت کی بنیاد پر مہاراشٹر پبلک سروس کمیشن جیسے مشکل ترین امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کر کے سماج میں ایک بہترین مثال قائم کی۔

وسیمہ شیخ نے اپنے بچپن کی غربت کے حالات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ہائی اسکول میں داخلہ لینے کے لیے ان کے پاس ساڑھے تین سو روپے تک بھی نہیں تھے۔ بڑی مشکل سے انھوں نے ان پیسوں کا بندوبست کیا۔ وسیمہ شیخ کی ابتدائی تعلیم اپنے ہی گاؤں کے ایک مراٹھی اسکول میں ہوئی۔ گاؤں میں ہائی اسکول کا نظم نہیں تھا جس کی وجہ سے انھیں گاؤں سے دور عثمان نگر گاؤں میں جانا پڑتا تھا۔ دسویں میں 87 فیصد نمبر سے کامیابی حاصل کرنے کے بعد انھوں نے اپنے ذہن میں یہ بات طے کر لی کہ مقابلہ جاتی امتحان میں وہ ضرور اپنی قسمت آزمائیں گی۔ گاؤں میں جہالت کی وجہ سے لڑکیوں کی تعلیم کو صحیح نہیں سمجھا جاتا تھا۔ گاؤں کے لوگوں کی مخالفت کے باوجود وسیمہ شیخ کے بھائی نے اپنی بہن کو تعلیم کے میدان میں آگے بڑھانے کا فیصلہ کیا۔

آج جب کہ وسیمہ شیخ ایم پی ایس سی کا امتحان پاس کر ڈپٹی کلکٹر بن گئی ہیں تو ان کے بھائی عمران شیخ نے اس پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ وسیمہ شیخ کے بچپن سے ہی یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ ذہین ہے اور اعلی تعلیم حاصل کر سکتی ہے۔ اس لیے ہم نے اسے تعلیم کے تمام مواقع فراہم کرنے کی کوشش کی۔ غربت اور دیگر مسائل کے باوجود ہم نے اس کی تعلیم کے سلسلے کو کبھی بند نہیں کیا۔ آج جبکہ اس نے ایم پی ایس سی امتحان پاس کر لیا ہے ہمیں بہت زیادہ خوشی ہو رہی ہے۔ وسیمہ شیخ کی والدہ سلیمہ بی نے بھی اپنی بیٹی کی کامیابی پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ وسیمہ کی کامیابی سے ہمیں بہت خوشی ہوئی ہے۔ ہم نے اپنی غربت اور مفلسی کو اس کی تعلیم کی راہ میں رکاوٹ بننے نہیں دیا۔ لڑکیوں کی اعلی تعلیم کو لے کر گاؤں کے لوگوں کی مخالفت کے باوجود ہم نے اس کی تعلیم کے سلسلہ کو جاری رکھا اور نتیجہ آج ہم سب کے سامنے ہے۔

مقابلہ جاتی امتحانات میں کامیابی حاصل کرنا ایک بڑا چیلنج سمجھا جاتا ہے۔ اس میں حصہ لینے والے طلبہ کی تعداد لاکھوں میں ہوتی ہے جبکہ چند سو افراد کو ہی کامیابی نصیب ہوتی ہے۔ تحریری امتحان کے لیے انٹرویو کے مرحلے سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔ ان تمام مراحل کو پار کر کے وسیمہ شیخ آج ایک کامیاب شخصیت بن کر ابھری ہیں جن کی چوطرفہ ستائش ہو رہی ہے۔

(ناندیڑ۔ 27 جون 2020 (نیوز 18 اردو)

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

ابوالکلام آزاد ایک ہمہ گیر شخصیت

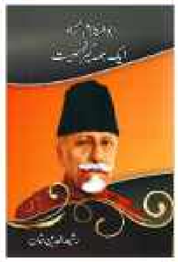

مصنف: رشیدالدین خان

صفحات: 684

قیمت: 235 روپے

فرہنگِ مولانا ابوالکلام آزاد

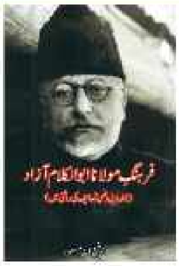

مصنف: رفیع اللہ مسعود

صفحات: 669

قیمت: 290 روپے

درسِ بلاغت

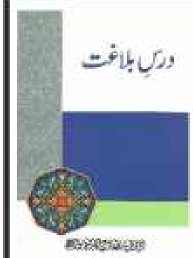

ادارہ

صفحات: 230

قیمت: 85 روپے

قومی یکجہتی ایک مطالعہ اور تجزیہ

مصنف: ابوسفیان

صفحات: 203

قیمت: 110 روپے

گوپال متل (مونوگراف)

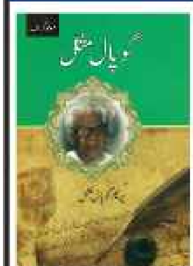

مصنف: پریم گوپال متل

صفحات: 117

قیمت: 80 روپے

کوثر چاندپوری (مونوگراف)

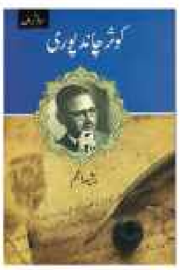

مصنف: رشید انجم

صفحات: 150

قیمت: 90 روپے

سماجی تحقیق

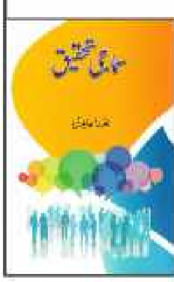

مصنف: عذرا عابدی

صفحات: 490

قیمت: 215 روپے

جدید ہندی شاعری پر اردو کا اثر

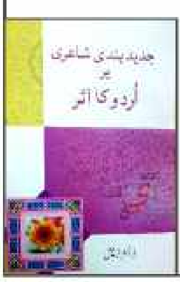

مصنف: ڈاکٹر نریش

صفحات: 155

قیمت: 90 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Mahnama Khawateen Duniya Monthly August 2020, Vol. 4, Issue: 8 **RNI. No. DELURD/2017/74026**
ISSN 2581-4826
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان وادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے
مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!
ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے
(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad , Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 Institutional Area Jasola New Delhi-110025